MAY
2025

جدید شعر و ادب کا نمائندہ

ماہنامہ بیاض لاہور

یکم مئی

عالمی یوم مزدور

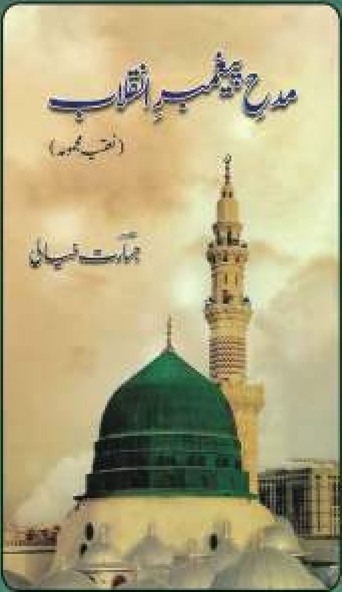
مدحِ پیغمبرِ انقلاب

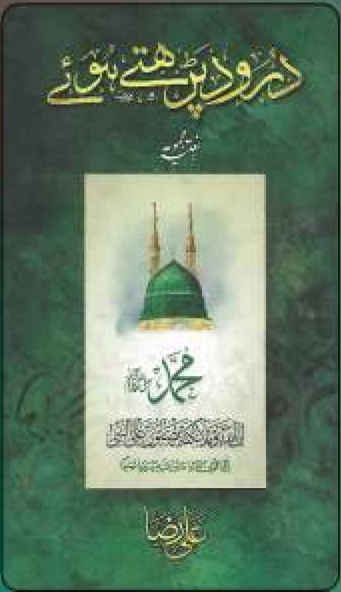
درود پڑھتے ہوئے
علی رضا

آخر شب کے مسافر
بریگیڈیئر (ر) محمد یوسف

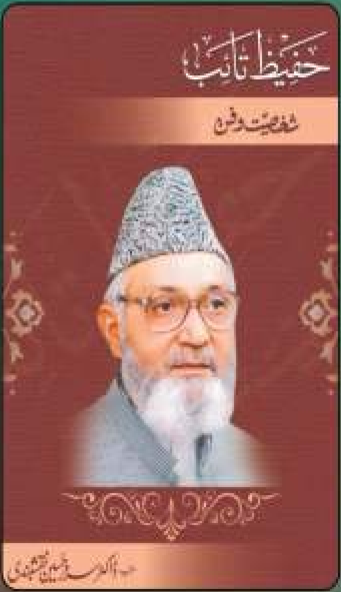
حفیظ تائب
شخصیت و فن

اختر حسین جعفری کے لیے ...۱

کھلا عمامۂ کہسار، برف بال اڑے
زمیں پہ آن رہا نخلِ گریہ و ماتم
بھگو رہا ہے بدن نوحہ آبشاروں کا

ہوائے تند کے سینے سے لگ کے گریاں ہیں
کہیں گلاب، کہیں یاسمن کہیں سوسن
ہیں کس مہک کے عزادار، شاہدانِ چمن

کہیں وہ چھب نظر آئے، وہ ڈھب دکھائی پڑے
اٹھ اٹھ کے دیکھتے ہیں، رمز کیا؟ اشارہ کیا؟
پلٹ سکا نہ بیاباں نوردِ بود و نبود

حیات، کنجِ خمِ کاکلِ مسلسل ہے
نہالِ غم پہ فقط آبلے مہکتے ہیں
سپیدۂ تنِ مہجور ہو گیا کافور

کنایہ کار گیا، استعارہ کار گیا
نئے مزاج کی سطریں، انوکھے ڈول کے بند
نئے طیور، نئے ساحلوں پہ اترے تھے

پسِ سخن، سخن آرا ہے خاکِ سجادہ
ترا سخن، تب و تابِ حیات رکھتا ہے
کہ تیرا فن، نمِ آبِ حیات رکھتا ہے

یہ نیشِ مرگ سَم آغشتۂ حیات رہا
ستارہ وار، دھڑکتے دلوں پہ اتریں گے
ترے طیور، نئے ساحلوں پہ اتریں گے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL | Freight Forwarding | Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 37083901-9
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5252311 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 33 - مئی 2025 - شمارہ نمبر: 5

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: عالمی یومِ مزدور

قیمت: 100 روپے

سالانہ زرِ اعانت 1000 روپے بیرون ملک $100 پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

A/c Title: Monthly BAYYAZ

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ www.trackntie.com BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر نزد فارمیسٹ مال اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَّأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	اکرم سحر فارانی، سرور حسین نقشبندی	7 تا 8
2	نعت	جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، نثار ترابی، اکرم ناصر، افروز رضوی، ذکی طارق، سرور حسین نقشبندی، امجد بابر، نوید عاجز، مظہر امام	9 تا 19
3	عقیدت	سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز، سید ضیا الدین نعیم، محمد انیس انصاری، رضا اللہ حیدر، مرزا آصف رسول، فیض رسول فیضان، شہاب اللہ شہاب	20 تا 28
4	رباعیات	محمد نصیر زندہ	29
5	مضامین	توصیف تبسم، جلیل عالی، نسیم سحر، نثار ترابی، نجیب جمال، رحمان حفیظ، افتخار الحق، علی رضا، ہارون الرشید، شہاب صفدر، ثمینہ سید، شاہد دلاور شاہ، حسن نواز شاہ، ریاض ندیم نیازی، ورداہ نوشین خان، مرزا اسکندر بیگ، وحید اللہ وحید، طلحہ غفور	30 تا 87
6	پنجاب کے گمشدہ کردار: مائی ملکی	اعجاز رضوی	88 تا 91
7	انٹرویو: حمید شاہد	سید تحسین گیلانی	92 تا 94

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
8	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، اعجاز کنور راجہ، سید ریاض حسین زیدی نسیم سحر، گلزار بخاری، خاور اعجاز، شاہ محمد سبطین شاہجہانی شریف ساجد، صفدر صدیق رضی، راحت سرحدی، رحمان حفیظ مسعود احمد، شاہد اشرف، شکیل جاذب، عماد اظہر، محمد انیس انصاری افتخار شاہد، خورشید ربانی، اقبال سروبہ، افروز رضوی، ذکی طارق محمد افتخار شفیع، ذوالفقار عادل، شمشیر حیدر، میثم نقوی سجاد بلوچ، عقیل رحمانی، مقصود جعفری، اجمل اعجاز، رضا اللہ حیدر منظر اعجاز منظر، اعظم کمال، مظہر امام، اکرم جاذب، احمد جلیل اکرم سحر فارانی، اوصاف شیخ، اکرم ناصر، محمد نوید مرزا راجہ عبدالقیوم، عرفان صادق، صغیر احمد صغیر، افتخار شوکت ارشد محمود ارشد، افضل ہزاروی، ظہور چوہان، شوکت محمود شوکت اقبال ناظر، بیاجی، رخشندہ نوید، ثمینہ سید، احمد سبحانی آکاش نائلہ راٹھور، رداحاصل خلوص، محمد اشرف کمال، خالدہ انور آفتاب خان، اکرام الحق سرشار، نثار بریکی، اعجاز دانش نبیل احمد نبیل، محمد یوسف، انصر حسن، اعجاز روشن، عمران ہاشمی شبہ طراز، پروین سجل، ساگر حضور پوری، مستحسن جامی، میتھیو محسن سرور فرحان، عابد معروف مغل، زعیم رشید، محمد اشفاق بیگ محمد لیٰسین بھٹی، شاہد شوق، محمد علی ایاز، ندیم ملک، بشیر احمد حبیب محمد علی ادیب، عطا العزیز، عبدالرؤف زین، امجد خان تجوانہ اکمل حنیف، امجد بابر، سرفراز عارض، شازیہ اکبر، عابد رضا چیا قریشی، طلحہ غفور، حافظ الیاس حافظ، فرزان خان عباس علی شاہ ثاقب، امیر حیدر، وریداللہ وریدہ، اویس اکبر، اعجاز رضوی	95 تا 191
9	افسانے	[جیفرے آرچر / ترجمہ: پیروز بخت قاضی]، کلیم خارجی سیما پیروز، وردانہ نوشین خان، سلمان یوسف سمیجہ، بابر ایمن ابر	192 تا 214
10	مائکروفکشن	شہزاد نیر، عاصم بخاری	215 تا 216
11	طنز و مزاح / خاکے	ہمایوں خان، سیدہ آمنہ ریاض، کومل شہزادی، محمد کلیم، اعجاز رضوی	217 تا 230
12	نظمیں	آصف ثاقب، محمد انیس انصاری، صفدر صدیق رضی، منظور ثاقب طالب انصاری، عنبرین صلاح الدین، شوکت محمود شوکت نائلہ راٹھور، سید طاہر شیرازی، وقار احسن، اعجاز رضوی	231 تا 241

حمد

پھول پتے ٹہنیاں خوشبو کے دھارے رکھ دیئے
کس نے اک ذرّے میں یہ سامان سارے رکھ دیئے

کر رہا ہے کون پس منظر میں یہ گُل کاریاں
کس نے نظروں میں مناظر پیارے پیارے رکھ دیئے

انبیا کو حق نے بخشے چیدہ چیدہ معجزے
مصطفیٰ کی ذات میں سارے کے سارے رکھ دیئے

عرشِ اعظم پر بلایا صاحبِ معراج کو
رہگزر میں جگمگاتے چاند تارے رکھ دیئے

منزلِ حق کے مسافر کو پریشاں دیکھ کر
رہنمائی کے لئے قرآں کے پارے رکھ دیئے

رکھ دیئے آنکھوں میں چشمے اور پھر چشموں کے گرد
خالقِ مطلق نے پلکوں کے کنارے رکھ دیئے

ماں کو بچے سے نوازا ہے تو اس سے پیشتر
دودھ کے چھاتی میں اُس کی گرم دھارے رکھ دیئے

پیار ستر ماؤں کا شانِ کریمی رحمتیں
بے سہاروں کے لئے کیا کیا سہارے رکھ دیئے

کوہساروں کو عطا فرما دیئے ہیں آبشار
خشک صحراؤں میں دریاؤں کے دھارے رکھ دیئے

اُس نے جب چاہا زمیں کو بخش دیں ہریالیاں
اور جب چاہا سبھی منظر اُتارے رکھ دیئے

اکرم سحر فارانی

حمد

پیکرِ جاں میں نور تیرا ہے
ہر نفس میں ظہور تیرا ہے

پتہ پتہ تری گواہی دے
ڈالی ڈالی پہ بور تیرا ہے

تو ہر اک جا بھی ہے مگر مسکن
ماورائے شعور تیرا ہے

لطف عصیاں سرشت بندوں پر
پھر بھی رب غفور تیرا ہے

تجھ سے کچھ بھی نہیں ہے پوشیدہ
سب غیاب و حضور تیرا ہے

آنکھ یک دم کھلی ہے پچھلے پہر
یہ بلاوا ضرور تیرا ہے

حرف و صوت و ثنائے سرور میں
سارا جذب و وفور تیرا ہے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

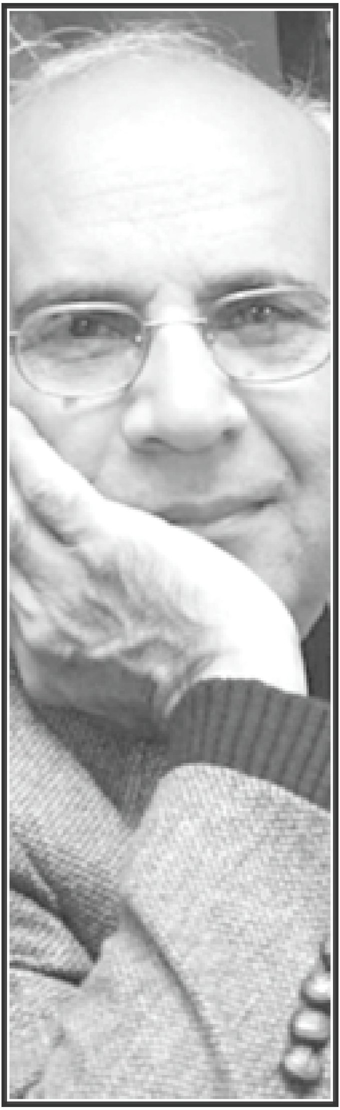

یہ بحرِ ہست ابھی تھا سراب کی صورت
اُسؐ سے شہود ہوئی ہر غیاب کی صورت

سروں سے ٹلتی ہے کیا کیا عذاب کی صورت
کرم برستا ہے اُسؐ کا سحاب کی صورت

زمیں کی دھج ہوئے آئین و آدمی کیا کیا
مگر وہ ایک ہی سیرت کتاب کی صورت

سرِ حرا جو سوالوں میں درد اُسؐ کے ڈھلے
فلک سے آیتیں اُتریں جواب کی صورت

بھری ہوئی ہے بدی سے ورق ورق تاریخ
اک اُسؐ کا عہد ہے بے داغ باب کی صورت

ہے اُسؐ کے سایۂ رحمت میں یہ جہاں ورنہ
ہر ایک روز ہو روزِ حساب کی صورت

اُس آفتابِ زمانؐ سے نہ گر ضیا ملتی
دمکتی کیسے کسی ماہتاب کی صورت

جلیل عالی

نعتؐ

شدید حبس کا عالم ہے، بے کلی افزوں
میں کاش گنبدِ اخضر کی خوش فضا میں بسوں

طلسمِ وہم و گماں کا اندھیر برپا ہے
کرم ہو ماہِ عرب کا، ملے ثبات و سکوں

شرارِ بولہبی سے نگاہیں خیرہ ہیں
نگاہِ عشقِ محمدؐ میں آسکوں تو جیوں

اطاعت آپؐ کی ہاں طاعتِ خدا ہی تو ہے
سمجھ سکوں تو میں پا جاؤں رازِ کن فیکوں

ازل کا نور ملے جو ابد بداماں ہو
ہمیشہ دیدہ و دل مستنیر اس سے کروں

صد آفریں ہو نہایت کمال کا منظر
میں سنگ ریزوں کی حمد و ثنا سنوں، دیکھوں

ضرر رسانی (کثافت روِ زمانہ کی
کبھی نہ پہنچے گی مجھ تک جو سوئے طیبہ چلوں

یہی روش مرے ایمان کا تقاضا ہے
سنوں حضورؐ کی اللہ کے راستے پہ چلوں

ریاضؔ دل ہو معتبر کچھ اس طرح میرا
درودِ پاک ہو وردِ زباں جو نعت کہوں

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

وضو کر کے چوما ہے نامِ محمد
قلم کو بھی ہے احترامِ محمد

دہن مشکبو ہونے لگتا ہے یکدم
زباں پر جب آتا ہے نامِ محمدؐ

زمانہ بھی تقلید اس کی کرے گا
جو نافذ یہاں ہو نظامِ محمد

یہ سب اہلِ فکر و نظر جانتے ہیں
پیامِ خدا ہے پیامِ محمد

خدا کی عبادت، خدا کی اطاعت
گزرتے تھے یوں صبح و شامِ محمد

سدا کے لیے ہیں، سدا کے لیے ہیں
نہیں ہے زوالِ دوامِ محمد

ضیا بار اب بھی ہے کون و مکاں پر
ہے تابندہ ماہِ تمامِ محمد

مساوات کا وصف سیرت نبیؐ کی
سبھی پر کھلا لطفِ عامِ محمد

یہ معراج میں بھی اشارے ملے ہیں
خدا خود ہوا ہم کلامِ محمدؐ

مری حاضری میں حضوری ہو شامل
لکھا ہے یہ نامہ بنامِ محمدؐ

نسیمِ سحر، تم نہیں جانتے ہو!
تمہیں علم کیا ہے مقامِ محمد؟

نسیمِ سحر

نعتؐ

پھول میرے ہیں ، چاندنی میری
آپؐ کا ذکر بندگی میری

آپؐ کا اسم ہے وظیفہ مرا
آپؐ کا وِرد عاشقی میری

آرزو ہے قبول ہو جائے
آپؐ کے در پہ حاضری میری

ایک اِک لفظ آپؐ پر صدقے
ناز کرتی ہے شاعری میری

کیوں مری غم سے آشنائی ہو
آپؐ ہی سے ہے ہر خوشی میری

آپؐ نے چُن لیا غلاموں میں
رشک کرتی ہے زندگی میری

آپؐ پر جب دُرود پڑھتا ہوں
جھوم اُٹھتی ہے ہر گھڑی میری

نثار ترابی

نعتؐ

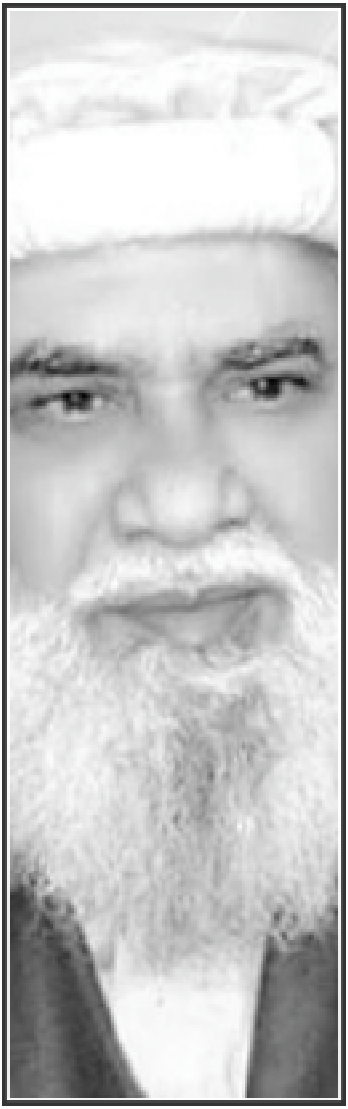

محفل میں ان کی نعت سنانے کی دیر تھی
بخشش کو صرف ایک بہانے کی دیر تھی

کوہِ صفا پہ سارے ہی بیگانہ بن گئے
میں کون ہوں بس اتنا بتانے کی دیر تھی

شہرِ نبی میں جانے کا پروانہ مل گیا
یادِ نبی میں اشک بہانے کی دیر تھی

خودسر تھے جو وہ آپ کے شیدائی بن گئے
چشمِ رسول پاک میں آنے کی دیر تھی

سب نیک و بد، حلال و حرام آ گئے نظر
سویا ہوا ضمیر جگانے کی دیر تھی

اڑتا ہوا میں شہرِ مدینہ پہنچ گیا
زادِ سفر کے جیب میں آنے کی دیر تھی

اکرم ناصر

نعتؐ

کرم کے پھول برسا دیجئے آقا مرے گھر پر
تنی ہو نور و ایماں کی حسیں چادر مرے سر پر

میں جھولی اپنی پھیلا کر کھڑی ہوں منتظر آقا
کرم کی بھیک مل جائے مجھے جو آپ کے در پر

تمنا ہے کہ ہوں سیراب ان کی دید سے آنکھیں
"عطا ہو جامِ محشر میں، ہمیں بھی حوضِ کوثر پر"

مدح خوانی کروں ایسی، مقدر ہی سنور جائے
کرم آقا کریں کچھ خاص، مجھ ایسی سخنور پر

بلاوا آ گیا حج کا، مدینے بھی میں جاؤں گی
نہ ہو پھر ناز کیوں افروز کو اپنے مقدر پر

افروز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

منہ دیکھتے ہی رہ گئے جادو بیاں سبھی
لب گنگ ہو کے رہ گئے معجز سخن تمام

نعتؐ

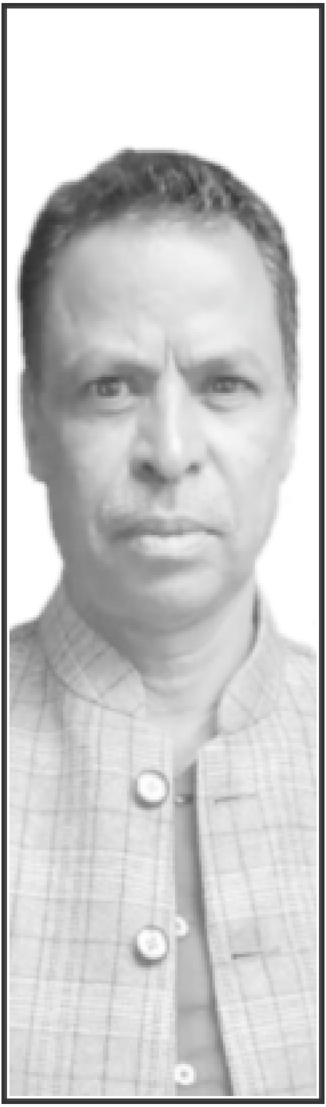

کرم آمیز دل آویز کیف انگیز کتنا ہے
مرے آقا کا اسمِ پاک راحت خیز کتنا ہے

دعائیں دشمنوں کے حق میں کیں دشنام کے بدلے
ہمارا شافعِ محشر بھی رحمت ریز کتنا ہے

نبی کا واسطہ پاتے ہی منھ مانگی ہے دیتا رب
اثر ان کے وسیلے کا سریع و تیز کتنا ہے

یہ سر میں اپنے کوئی اور سودا رکھ نہیں سکتے
نبی کے عشق کے دیوانوں میں پرہیز کتنا ہے

جدھر دیکھو ادھر ہی نور کے دریا امڈتے ہیں
مدینہ پاک ہر ذرہ ترا زرخیز کتنا ہے

سکونِ قلب مل جاتا ہے اسمِ پاک لیتے ہی
سمندر رحمتوں کے فیض کا لبریز کتنا ہے

کھڑا ہوں باادب میں روبروئے روضۂ اقدس
تصور ہی ''ذکی طارق'' یہ عشرت بیز کتنا ہے

ذکی طارق

نعت

ہم پہ چشمِ کرم کیجئے
منتشر ہیں بہم کیجئے

ان کے احکام مت بھولئے
خود پہ یوں مت ستم کیجئے

التجا کر رہے ہیں غلام
دور رنج و الم کیجئے

نعت کہنے کا گر ہو خیال
پہلے آنکھوں کو نم کیجئے

اپنی آنکھوں کا کر کے وضو
ان کی مدحت رقم کیجئے

پیروی کر کے سرکار کی
بندگی محترم کیجئے

زندگانی سنور جائے گی
آرزوئے حرم کیجئے

جتنی سرور ملے زندگی
مدحِ شاہِ امم کیجئے

سر کو رکھنا اگر ہے بلند
ان کی مرضی پہ خم کیجئے

صبحدم ان پہ پڑھ کر درود
اپنی آنکھوں پہ دم کیجئے

نعت کا جب ہو دل پہ نزول
گفتگو کم سے کم کیجئے

مرکز و محور زندگی
ان کا نقشِ قدم کیجئے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

نعت کہنے کی عبادت کا مزہ لیتے ہیں
تیرے درویش محبت کا مزہ لیتے ہیں

ہاتھ باندھے ہوئے پھرتے ہیں گلی کوچوں میں
بادشہ بھی تو عقیدت کا مزہ لیتے ہیں

اتنی اوقات کہاں آپ سے میری نسبت
کتنے خوش بخت رعایت کا مزہ لیتے ہیں

رہ نُما سارے جہاں کے مرے مکی مدنی
اپنے آقا کی حکومت کا مزہ لیتے ہیں

حُور و غِلماں سے ذرا دُور، محبت والے
اپنی قسمت کی سعادت کا مزہ لیتے ہیں

آنکھ والوں پہ تو روشن ہے بصیرت اُن کی
عقل والوں کی شہادت کا مزہ لیتے ہیں

زندگی خاک ہوئی خاک پہ رہ کر امجد
آ مدینے کی لطافت کا مزہ لیتے ہیں

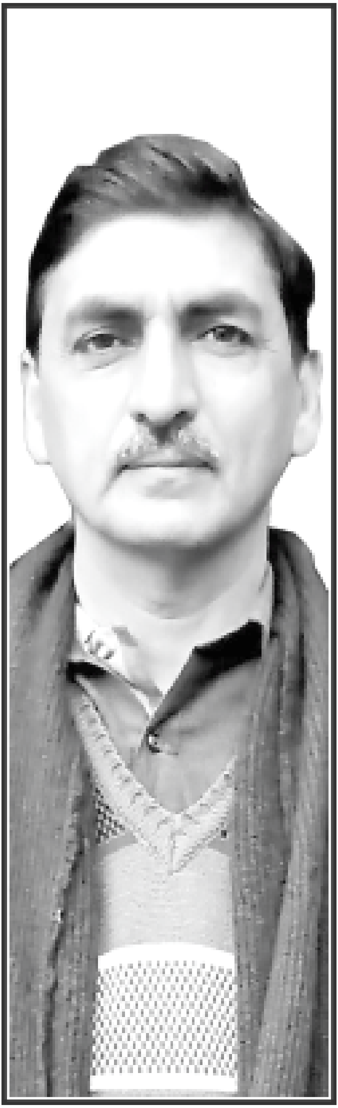

امجد بابر

نعتؐ

کس نفاست سے عیاں کردیا وحدت کا کمال
یہ کوئی کم تو نہیں آپ کی بعثت کا کمال

آج اسلام کی چلتی ہیں ہوائیں گھر گھر
میں اسے کیوں نہ کہوں آپ کی دعوت کا کمال

ورفعنا لک ذکرک سے یہی ظاہر ہے
بس خدا جانتا ہے آپ کی عظمت کا کمال

حکمراں بن گئے اُونٹوں کو چرانے والے
بے گماں یہ تھا فقط آپ کی صحبت کا کمال

شوقِ دیدارِ محمد میں مرا جاتا ہوں
دیکھنا ہے مجھے اس شدت حسرت کا کمال

عاصیو آؤ نہ ہم شہرِ مدینہ کو چلیں
دیکھنے کے لیے سرکار کی رحمت کا کمال

مغفرت کے کہاں لائق تھا نوید اپنا عمل
اپنی بخشش ہے فقط ان کی شفاعت کا کمال

نوید عاجز

نعتؐ

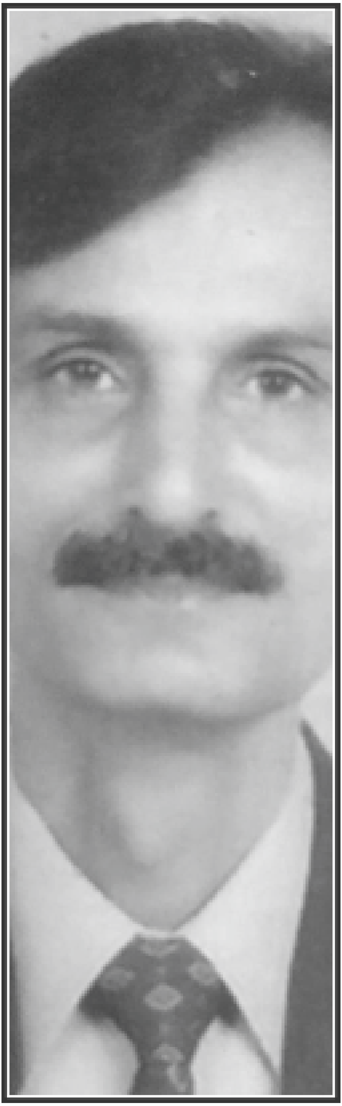

یہ سخن پروری حضورؐ سے ہے
نعت کی شاعری حضورؐ سے ہے

چار سو تیرگی کے عالم میں
ہر طرف روشنی حضورؐ سے ہے

جس نے بخشا شعور مدحت کا
یہ مری آگہی حضورؐ سے ہے

خوشبوؤں میں بسے ہیں لفظ مرے
سوچ کی تازگی حضورؐ سے ہے

اُن کی نسبت نے غم تمام کیے
زندگی میں خوشی حضورؐ سے ہے

کر سکے کون ہمسری اُن کی
جن کی وابستگی حضورؐ سے ہے

جس قدر بھی ہے اس زمانے میں
ساری عزت مری حضورؐ سے ہے

جو میسر ہے مظہروں کو امام
سب کی سب دلکشی حضورؐ سے ہے

مظہر امام

عقیدت

کیسا بھرپور، طرح دار مزہ دیتا ہے
لبِ تشنہ کو خدا آبِ بقا دیتا ہے

کبھی خالی نہ گئی حسنِ طلب کی جھولی
بے طلب کو بھی وہی حد سے سوا دیتا ہے

دیکھ لے کوئی ستارہ سرِ مژگاں چمکا
اس ندامت کو ستائش کا صلہ دیتا ہے

سیدھے رستے میں کوئی سنگِ گراں جو رکھ دے
ایسے نادان کو وہ سخت سزا دیتا ہے

رات کے پچھلے پہر کی جو عبادت دیکھے
ایسے عابد کو وہ انعام جدا دیتا ہے

جو بھی آتا ہے ریاض اس کے نگر کی جانب
اپنے محبوب کا گھر اس کو دکھا دیتا ہے

سید ریاض حسین زیدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر لفظ چاہتا ہے کہ اُس ذکر میں ڈھلے
در پر ہیں دست بستہ بتانِ سخن تمام

ہدیہ عقیدت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

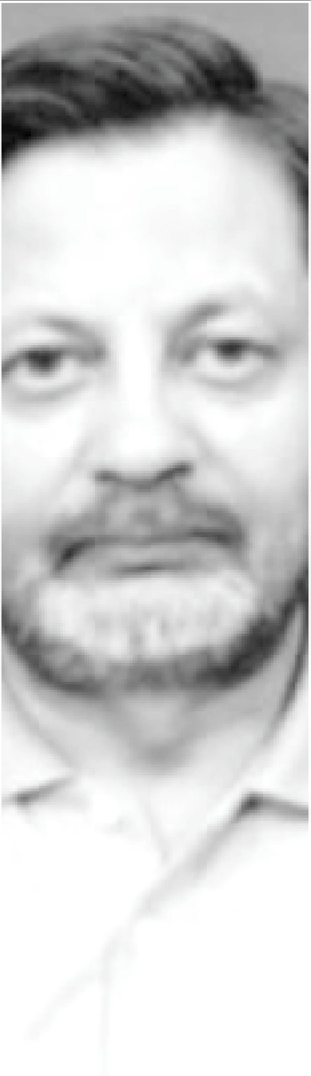

خاور اعجاز

زباں کو زورِ بیاں تیرے نطق نے بخشا
نظر کو نُورِ بصیرت عطا کِیا تُوؐ نے
وہ عہد جس میں کہ نفرت تھی خیمہ زن ہر سُو
وہاں چراغِ محبت جلا دیا تُوؐ نے

ترےؐ لیے یہ زمیں آسماں بنائے گئے
ترےؐ وجود سے ذہنوں میں تازگی آئی
ترےؐ حوالے سے سب نے خدا کو پہچانا
ترےؐ ہی دم سے چراغوں میں روشنی آئی

صراطِ حق سے ہمیں روشناس تُوؐ نے کِیا
ترےؐ وسیلے سے اک رہ ہمیں سجھائی دی
ازل ابد کی مسافت پہ یوں محیط ہے تُوؐ
ہر اِک زمانے میں آہٹ تریؐ سنائی دی

جہانِ معنیٰ میں اِک نُور استعارہ تُوؐ
دیارِ شوق میں خوشبو ترےؐ حوالوں سے
ہے حرف حرف میں روشن ترےؐ جمال کی لو
سمجھ میں آتا ہے قرآں تریؐ مثالوں سے

عقیدت

یہ سجدہ ریز جو ہم میں سے لوگ در در ہیں
عدم شناس مقامِ خدائے برتر ہیں

براہ راست، ہر انسان سے ہے رب کا ربط
سمجھ کے پھیر میں یہ واسطوں کے خوگر ہیں

خدا کے ڈر سے جو جاتے نہیں حرام کی سمت
وہ پیکرانِ قناعت ہی بس تونگر ہیں

اہالیانِ سرِ پُرغرور، کیا جانیں
عزیز رب کو ہیں...... جو عاجزی کا پیکر ہیں

کریں جو دنیا کو باور سرائے، مثلِ نبی
یہی تو لوگ ہیں جو صاحبِ مقدر ہیں

قلیل، سوچنے والے ہیں، رب کا ہے ارشاد
جو کام عقل سے لیتے نہیں، وہ اکثر ہیں

سید ضیاالدین نعیم

عقیدت

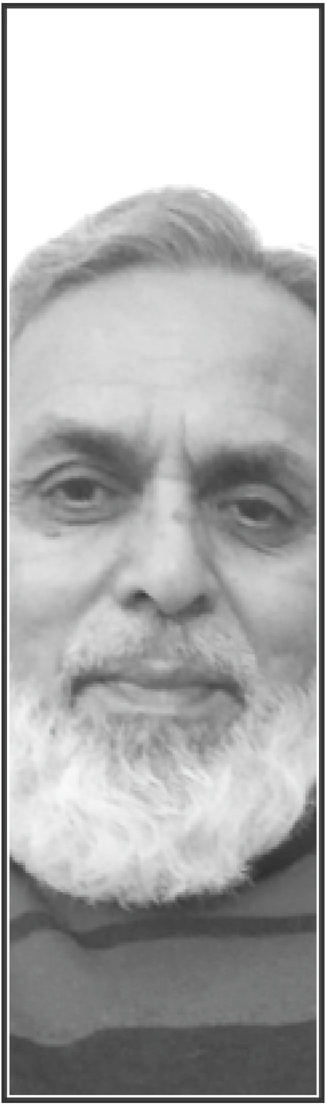

ہر دل میں ہر نگاہ میں عزت نبیؐ کی ہے
ہر لب پہ، ہر زبان پہ مدحت نبیؐ کی ہے

سارے نبیؑ ستارے اگر ہوں، تو اُن کے بیچ
اک چاند کی طرح سے فضیلت نبیؐ کی ہے

پُرنُور و دلنواز ہے چہرہ حضورؐ کا
پُرسوز و جاں گداز طبیعت نبیؐ کی ہے

کیا غم ہے، جب نبی ہیں ہمارے، ہم اُن کے ہیں
ہم اُمتی نبیؐ کے ہیں، جنت نبیؐ کی ہے

اولاد و والدین، صحت و رزق، عزّ و جاہ
کیا کیا شمار کیجیے، برکت نبیؐ کی ہے

سب سے بڑے نبیؐ کی ہے یہ انفرادیت
سب سے بڑی اور آخری اُمت نبیؐ کی ہے

دیوانگانِ عشقِ نبیؐ کی نہ پوچھیے
جس لمحہ امتحان میں حُرمت نبیؐ کی ہے

روئے زمیں پہ آخری انسان تک انیسؔ!
بہرِ نجات سب کو ضرورت نبیؐ کی ہے

محمد انیس انصاری

عقیدت

عدو گر دین کے قرآن کے مٹنے نہ پائیں گے
غلامانِ نبی کے حوصلے مٹنے نہ پائیں گے

نبی کے ذکر کو اللہ نے رفعت عطا کی ہے
نبی کی عظمتوں کے تذکرے مٹنے نہ پائیں گے

رسول اللہ کی ہر پیش گوئی سچ ہوئی ثابت
کلامِ مصطفیٰ کے معجزے مٹنے نہ پائیں گے

ہمیں ناموسِ احمد جان سے بڑھ کر ہوئی پیاری
شہادت کے معتبر سلسلے مٹنے نہ پائیں گے

رضا عشقِ نبی سے زندگی کی راہ روشن ہے
یہ جذبے خوش ثمر، یہ ولولے مٹنے نہ پائیں گے

رضا اللہ حیدر

لکھتے ہی اُنؐ کا اِسم مُبیںؐ جھلملا اُٹھیں
عرشِ ورق پہ کاہ کشانِ سخن تمام

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

الواحِ ارمغانِ حق

عشقِ نبیؐ میں ڈوبا ہوا کیا بتائے دل
دل جاں کی ہے جگہ پہ کہ جاں ہے جائے دل

اس سے بھی بڑھ کے رب کے ہیں نزدیک مصطفیٰؐ
ہر جاں کے خود قریب ہے جتنا خدائے دل

عشقِ نبیؐ ہے اپنے ہی اندر نمودِ جاں
زیبا نہیں وجود سے باہر ریائے دل

ہے ”بادِ صبح نورِ بہار“ ان کے آنے سے
جاں مہکے جن سے، شکر کے وہ گل کھلائے دل

رُشد و ھدیٰ کی روح محمدؐ ہیں، ان سے ہی
دیں کا ہے ملکِ جاں، وہی فرماں روائے دل

جیون میں کیوں گھٹن رہے؟ جب اس حبیب سے
الفت نسیمِ جاں ہے، محبت صبائے دل

کیوں ان سے عشق اور اطاعت میں فرق؟ جب
نہ دل الگ ہے جاں سے، نہ جاں ہے جدائے دل

اس شمعِ عشق پر کرے پروانہ سب فدا
اپنا وجودِ جاں ہے کہ حب و ھوائے دل

جس نے ”خلقت نورِ محمدؐ“ کہا وہی
بخشے ہیں ان کے نور سے جا کو جلائے دل

ضوِ عشقِ مصطفیٰؐ کی چراغاں نہ لائے گا
جاں! تیرے من میں جرأت نہ جب تک جگائے دل

وہ عبدِ حق، وہ داعیِ ایاک نستعین
ہر جاں کی ہے نصیر انہی کی دعائے دل

ہیں مصطفیٰؐ رؤف و رحیم، ان کی مان کر
جاں ہو گی پھر نہ اور کہیں مبتلائے دل

محمود لکھیں ہم، بھلے حماد انہیں کہیں
احمدؐ ہے جانِ نعت، محمدؐ ثنائے دل

ابرِ کرم گران کا نہ برسے تو کس طرح
عصیاں کے اس جہنمِ جاں کو بجھائے دل

ہے عرشِ لامکاں پہ وہ محبوب کے لیے
ہر جاں میں جو مکیں ہے بہ عرشِ علائے دل

لا ترفعوا سے جیسے ہے اصواتکم پہ ستر
دل پہ لباسِ جاں رہے، جاں پہ ردائے دل

ہو دل پہ لطفِ شاہِ زمن ، جانِ عشق کا
پھر خودگری کا جاں کو سلیقہ سکھائے دل

کیوں حسرتوں سے یثربِ غم پھر بنے کہ جب
جاں میں مدینہ صلِّ علیٰ کا بسائے دل

"لَا تَحْزَنُوْا وَلَا تَهِنُوْا" حق ہے عشق پر
جاں ہو جسے عزیز اسے کیا سنائے دل؟

ایماں ہے بندگی کا وجود اور مصطفیٰؐ
ہیں جانِ دل نواز، وہی جاں فضائے دل

اس جاں کے حشر میں بھی ہیں ملجا مرے شفیع
دنیا میں جس نے ان سے ہے کی التجائے دل

ہو دل کا وردِ صلِ وسلم کہ حرزِ جاں
درماں ہے جاں کے درد کا بھی یہ دوائے دل

ملتی ہے سب کو ان کے وسیلے سے مغفرت
وہ جاں کا ہے گناہ کوئی یا خطائے دل

پایا ہے زیست نے یہ شعور آنحضورؐ سے
کتنا ہے جاں پہ لطف؟ ہے کیسی عطائے دل؟

عصیاں کی ظلمتوں کا رہے گا نہ ڈر کہ جب
جاں میں چراغِ صلِّ علیٰ کے جلائے دل

ہو گی حسین اور یہ رنگوں کی کائنات
جب جاں پہ رنگ صلِّ علیٰ کا جمائے دل

"الواحِ ارمغانِ حق" ان کو کروں جو پیش
لکھوں میں اپنی جاں پہ بھی اُن کی ثنائے دل

ہے کون؟ اُس غلامِ رسول ایسا جاں نثار
ہر دم مجاہدانہ ہو جس کی صلائے دل

حُبِّ خدا کا ملتا ہے آصف! ثمر اُسے
جس جاں میں نخلِ فاتبعونی اُگائے دل

مرزا آصف رسول

مناجات

برسوں پُرانی ختم ہو اُفتاد ، یا وُدود!
کشمیر دلپذیر ہو آزاد ، یا وُدود!

آگ اور خون میں ہے گھری وادیِ بہشت
ہر گام دندناتے ہیں جلاد ، یا وُدود!

اِسلامیوں پہ نظرِ کرم ، صدقۂ حبیبؐ
ویرانۂ جمال ہو آباد ، یا وُدود!

مکّار ہندوؤں کے مظالم سے آ کے تنگ
مظلوم کر رہے ہیں یہ فریاد ، یا وُدود!

کتنے ہی اولیا کا ہے مرکز یہ سرزمیں
اُن کے طفیل کر اِسے آزاد ، یا وُدود!

جپتے ہیں "رام رام"، بغل میں چھری لیے
یہ برہمن ہیں کیا ستم ایجاد ، یا وُدود!

غازی شہید ، غیبی مدد کے ہیں منتظر
فرما بھی زیرِ دستوں کی امداد ، یا وُدود!

کشمیر ہو غزہ کہ فلسطین ، الغرض
اُمّت یہ ہر مقام ہے برباد ، یا وُدود!

فیضان کو ہے عالمِ اسلام کی تڑپ
رکھ اپنی رحمتوں میں ہمیں یاد ، یا وُدود!

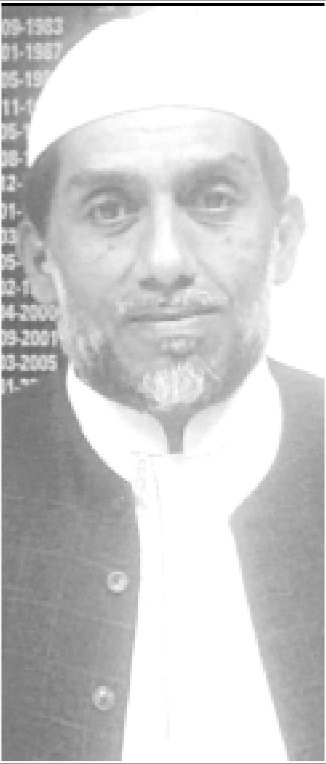

فیض رسول فیضان

عقیدت

شہاب اللہ شہاب

دل سے دعا یہ مانگی ہے سجدوں کے طول میں
گزرے یہ عمر عشقِ نبی کے حصول میں

آیا ہوں گُل کی آس میں پیارے رسول میں!
خارِ گنہ ہے دامنِ عصیاں ببول میں

اے کاش خواب میں ہو زیارت حضور کی
یہ بات راس آئے دعائے قبول میں

اپنے سبھی اصول ہوں قربان آپ پر
شامل ہے نکتہ یہ بھی ہمارے اصول میں

ہو مصطفٰی کی راہ پہ چلنا ہمیں نصیب
گزرے نہ زندگی یہ ہماری فضول میں

دونوں جہاں کے گنجِ گراں مایہ ہیں عزیز
بکھرے پڑے ہیں آپ کے قدموں کی دھول میں

دنیا کی خوشبوؤں میں نہ جنت میں ہے کہیں
خوشبو بسی ہوئی ہے جو یثرب کے پھول میں

ملتی نہیں جہاں میں کوئی ایک بھی مثال
جو بات ہے شہاب خدا کے رسول میں

رباعیات

نقشِ تصویر گر مجھے دیکھتا ہے
نظارہ دید بھر مجھے دیکھتا ہے
ٹکڑا ٹکڑا پیرہنِ عکس ہوں میں
آئینہ ٹوٹ کر مجھے دیکھتا ہے

آواز پہ سائے کی قبا ہوتی ہے
سناٹے میں زور کی صدا ہوتی ہے
بک جائیں قلم تو سر قلم ہوتے ہیں
منبر ہوں چپ تو کربلا ہوتی ہے

رنگ اس کے سراپے سے پھسل جاتے ہیں
رستے قوسِ قزح میں ڈھل جاتے ہیں
وہ ریشمی آنچل کہیں لہرائے تو
تصویر کے پیرہن بدل جاتے ہیں

طوفاں کے ہوا سے رابطے ہوتے ہیں
فتنے پہ سوار راستے ہوتے ہیں
رک جائیں نہ کیوں عرصۂ محشر کے قدم
محشر سے سوا بھی حادثے ہوتے ہیں

زلفوں کی گھٹائیں گنگناتی ہیں تجھے
مغرور حسینائیں جگاتی ہیں تجھے
اٹھ جاگ کہ تقدیر ابھی سوئی نہیں
اٹھ جاگ کہ منزلیں بلاتی ہیں تجھے

اشکوں کی برات ہے گزر جائے گی
موت ایک حیات ہے گزر جائے گی
نکلے گا صبح آرزو کا سورج
رات آخر رات ہے گزر جائے گی

ساقی سے سبو کی روشنی ہوتی ہے
مٹی میں نمو کی روشنی ہوتی ہے
جلتے ہیں وطن کی خاک میں دل کے چراغ
پھولوں میں لہو کی روشنی ہوتی ہے

آئینۂ رخسار ترا عشق پناہ
گر جائے ترے پاؤں میں تقویٰ کی کلاہ
زم زم کبھی کوثر کبھی تسنیم کبھی
تیرے لبوں کے کتنے مقدس ہیں گناہ

محمد نصیر زندہ

سبطین شاہجہانی کی نعت گوئی

حبِ رسولؐ ایک مسلمان کے ایمان کا جزو ہے۔ شاعری چونکہ ایک سماجی عمل ہے، اس لیے شاعری کی وہ صنفِ خاص جس کو نعت کہتے ہیں۔ اس محبت کو عام کرنے کا موثر وسیلہ ہے۔ نعت کہنا، نعت گو شاعر کے لیے موجب تسکین ہی نہیں، ایک کارِ خیر بھی ہے۔ سبطین شاہ جہانی کی نعت اس اعتبار سے دوسرے نعت گو شعرا سے منفرد ہے کہ ان کے یہاں حال اور قال میں کوئی حدِ فاصل نہیں ہے۔ وہ سالکِ راہِ طریقت ہیں۔ اس لحاظ سے نعت کہتے ہوئے، وہ ان نازک مقامات سے باآسانی گزر گئے ہیں، جہاں بعض دوسرے نعت گو شعرا رشتہ بپا نظر آتے ہیں۔

سبطین نے بہت سے دوسرے شاعروں کی طرح شعر گوئی کا آغاز غزل ہی سے کیا۔ غزل سے نعت کی طرف آتے ہوئے، انھیں زیادہ دقت پیش نہیں آئی کیونکہ نعت اور غزل دونوں ہی داخلی اصناف شعری ہیں، یعنی شاعر ان دونوں پیرایہ ہائے اظہار کے وسیلہ سے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا سے زیادہ اپنی باطنی کیفیات کا اظہار کرتا ہے۔ اگر یہ کیفیات قلبی کسی ارفع تر ہستی کی محبت کے زیرِ اثر پیدا ہوئی ہوں تو شاعری میں از خود ایک ترفع پیدا ہو جاتا ہے۔ سبطین شاہ جہانی نے جو فنِ شعر میں ایک عمر ریاضت کی ہے، وہ تمام تر ان کی نعت گوئی میں کام آئی۔ وہ طبع زاد مشکل زمینوں میں بے تکان شعر کہتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی نعتیں پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے جیسے کوئی ہموار دریا اپنی کیفیت میں، کناروں کے نظاروں سے بے نیاز بہتا چلا جا رہا ہو۔ ردیف اور قافیہ کی اوگھٹ گھاٹی سے گزرتے ہوئے، اظہار و معانی کی تازگی کو برقرار رکھا، سبطین کی سلامتی طبع کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ ان کو تادیر تندرست و توانا رکھے تاکہ وہ اسی طرح ہمارے لیے ضیافتِ روحانی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

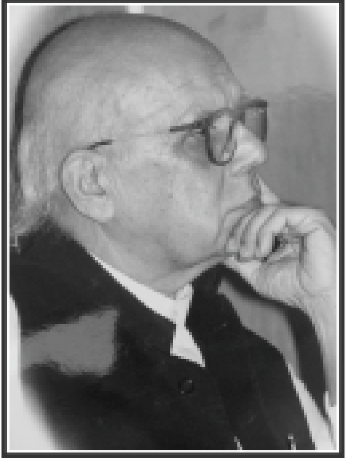

توصیف تبسم

دلاور کی ''ابجد''

اس لیے میں اسے پھیلاتا چلا جاتا ہوں
بات جھوٹی ہے مگر بات میں دم تو ہے نا

....

مجھے لگتا ہے کہ آزر کے اس شعر سے تخلیقی مضمون آفرینی کی اہمیت کے معانی بھی اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ یعنی معانی کی ایسی دنیا تخلیق کرنا کہ بھلے حقیقت میں وہ ناموجود ہو مگر اس کی موجودگی کا احساس ہونے لگے مگر جہاں تک دلاور کا تعلق ہے وہ بیشتر حقیقت سے ناطہ توڑے بغیر ایسے زاویوں کی نشاندہی کرتا ہے جس طرف قاری کا پہلے دھیان نہیں گیا ہوتا۔ یوں دریافت کا یہ عمل جو حیرت جگاتا ہے وہ دل و دانش دونوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں تاہم وہ جب ناممکن کی دھند سے بھی امکانات کشیدنے کے جتن کرتا ہے تو وہ اکارت نہیں جاتے۔ اور اصیل شاعری کا سراغ دیتے ہیں۔ اس عمل میں اس کی مضبوط بندش بھی اپنا اعجاز دکھاتی ہے۔ یہ استعداد اسے اس کے ایسے ہم عصروں سے ممتاز کر دیتی ہے جن کی ساری توجہ وقیع مضامین کے بجائے بندش کی استادانہ چستی پر مرکوز رہتی ہے۔ میری دانست میں دلاور علی آزر کا شمار ظفر اقبال کی شعر گری سے متاثر ہونے والوں کی بھیڑ بیچ ان چند جونیئر شعرا میں ہوتا ہے جو مضمون آفرینی کے درست شعور کے باعث بے مثال جودت کے حامل اس غیر معمولی مشاق سینیئر غزل گو کی بیشتر لاجمال و بے مآل مضمون تراشیوں کی لت سے خود کو بچا لے جانے میں کامیاب رہے ہیں۔ دلاور کو اس کے شبانہ روز شعری انہماک اور ریاض سے اپنے حروفِ فن میں اپنی مرضی کی عددی و قدری طاقتیں اتارنے کا اسم القا ہو گیا ہے۔ اسی لیے وہ کہتا ہے:

کبھی بھی چمکا نہیں جس میں کوئی عکس آزر
اس آئنے پہ خد و خال دم کریں گے ہم

....

دلاور کی اپنی ابجد کی کارفرمائی کے چند نمونے دیکھیے:

یہ صرف سمتیں نہیں آئنے ہیں حیرت کے
سو رختِ جاں انھی چاروں کی نذر کر دوں گا

اب آ کے دیکھیے منظر کی آب و تاب آزر
کہ اس نے آٹھواں رنگ اب دھنک میں ڈال دیا

جلیل عالی

یہ راز جب سے کھلا ہے کہ میں یہاں کا نہیں
پرائے لگتے ہیں آزر مجھے جہان کے لوگ

میں روشنی سے بھی آگے نکلنے والا تھا
پھر ایک دن مری رفتار ایک دم سے گری

پھر ایک روز اسے کام پڑ گیا ہم سے
ہمیں لگا تھا کہ بیکار سانس لے رہے ہیں

میں اپنے گھر میں اکیلا تھا اور آخرِ شب
مجھے لگا در و دیوار سانس لے رہے ہیں

اڑا کے خاک بنانا ہے آسمان آزر
اور اس پہ کوئی ستارہ نہیں بنانا مجھے

سخن میں شور ملاتے نہیں زمانے کا
میاں یہ کھیل بہت خامشی سے کھیلتے ہیں

کرتا ہے سارے کام خدا اپنے ہاتھ سے
انسان کو یہ لگتا ہے انسان کرتا ہے

جانے کس رنگ میں اب مجھ کو جھلکنا ہو گا
جانے اب کون سے منظر میں اکیلا میں ہوں

جس کی لہروں سے گزرتی ہیں ہماری لہریں
ہم وہی بحر بلوتے ہوئے مر جاتے ہیں

ذرا جدید زمانے کی سائیکی سمجھو
سخن کو نعرہ بناؤ کہ نعرہ چل رہا ہے

جن پنچھیوں کی قید میں ہوں
ان پنچھیوں کو رہا کروں گا

میں سوچتا ہوں کہ دربارِ عشق میں آزر
کسی فقیر سے کچھ دن دھمال بدلی جائے

جس کو تجھ ہجر کی تمثیل بنایا گیا ہو
کس قدر قیمتی ہوتا ہے وہ آنسو مرے دوست

قدیم وقت مرے ساتھ گنگنانے لگا
میں ایک بیتے ہوئے دن کی دھن بنانے لگا

کسے پتا مجھے آواز کس نے دی آزر
کسے خبر کہ میں رفتار کیوں بڑھانے لگا

فیصلے اپنی طرف سے بھی کیے ہیں آزر
سب درست اور غلط پر نہیں چھوڑا میں نے

نہ پھول شاخ سے توڑا نہ رنگ اڑاتے ہیں
ہم اپنے خواب کی چھت پر پتنگ اڑاتے ہیں

میں نے جلتے ہوئے کاغذ پہ کبھی لکھی تھی
نظم کی راکھ پڑی ہے مری الماری میں

تو نے دیکھا جسے نظر بھر کے
اس کو بہتر دکھائی دینے لگا

وہ تو کچھ مصلحتِ عشق و جنوں ہے آزر
ورنہ میرے لیے دیوار بھی دروازہ ہے

☆☆☆☆☆

اسلم سحاب ہاشمی کا ''خواب شجر''

ادبی کائنات میں نسبتاً کم متعارف نوجوان شاعر اسلم سحاب ہاشمی کی غزلوں کا یہ مجموعہ ایک سو بارہ صفحات تک ہی محدود ہے، تاہم ان کا فنی و تخلیقی سفر اس کم ادبی عرصے میں خاصی اہم اور قابلِ تحسین منزلیں طے کر چکا ہے۔ اس شعری مجموعے میں صرف ساٹھ غزلیں شامل ہیں لیکن یہ ساٹھ غزلیں اپنے معیار کی رفعتوں اور ہمہ رنگی کے ساتھ بلاشبہ مقداری کمی کا پورا پورا ازالہ کر رہی ہیں۔ کتاب کا ایک منفرد انداز کا عنوان ''خواب شجر'' بھی اپنے جدید انداز کی ترکیب کے ساتھ خواب کو ایک حسی تمثالی پیکر عطا کرتا ہے۔ معروف نقاد اور شاعر ڈاکٹر طارق ہاشمی نے اس حوالے سے بڑی خوبصورت بات کہی ہے:

''خواب ایک ایسا درخت ہے جو تعبیر کی کسی فصلِ بہار کے انتظار میں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شاعر خود کو ایک ماحول میں سانس لیتا ہوا محسوس کر رہا ہو جو خوابوں کے اشجار سے محروم ہے اور وہ اپنے ہم نفسوں کے ساتھ خوابوں کی سائبانی سے محروم چلچلاتی دھوپ میں اپنے وجود کو پگھلا رہا ہے''۔

رحیم یار خان سے تعلق رکھنے والے اسلم سحاب ہاشمی اب ساہیوال کے زرخیز علاقے میں مقیم ہیں جہاں وہ کسی شور شرابے کے بغیر گلزارِ سخن کی آبیاری کر کے رنگا رنگ کے شعری گلبن اُگانے میں شب و روز مصروف ہیں۔

اس کتاب میں اسلم سحاب کی علامتی کائنات میں شجر اور اس کے جملہ متعلقات کو معنی خیز کنایوں اور استعاروں میں برتا گیا ہے۔

ان کی غزلوں میں جو ایک وصف خاص طور پر قابلِ ذکر ہے وہ اسلم سحاب کا فنِ تصویر کشی ہے جس کے ذریعے وہ بہت سے کول جذبوں کی عکس بندی بھی کرتے ہیں اور سماج میں بکھرے مسائل و آلام سے جنم لینے والے تلخ احساسات کو بھی تمثال کے روپ میں ڈھال دیتے ہیں:

جذب دروں کا بھید بتاتی ہیں کھڑکیاں
تیرہ نگر میں پھول کھلاتی ہیں کھڑکیاں

معروف سینئر ادیب اور دانشور ڈاکٹر انوار احمد کی یہ رائے انتہائی اہم ہے جن کے حرف حرف سے اتفاق کرتے ہی بنتی ہے:

''ہمارے اس شاعر کے پاس معصومانہ امنگ کے ساتھ مشاقی بھی ہے جو اس کے مصرعوں کے در و بست اور زمینوں کے

نسیم سحر

انتخاب سے ظاہر ہوتا ہے -- وہ بغاوت کے الاؤ کے باوجود روایت کے چراغ کو تھامے ہوئے ہے اس لیے اس کی آواز کو دیر تک اور دور تک سنا جائے گا"۔

البتہ ممتاز نقاد اور شاعر خاور اعجاز کی رائے میں جو نکتہ مشوراتی انداز میں اٹھایا گیا ہے، وہ راقم السطور کے خیال میں اسلم سحاب ہاشمی کے لیے اپنے مستقبل کے تخلیقی وارتقائی سفر کے لیے خاص طور پر قابلِ توجہ ہونا چاہیے:

"ان کی غزل اگرچہ رنگی مضامین کا مجموعہ ہے اور معاصر زندگی کے معاملات پر رواداری میں اپنے ردِعمل کا اظہار ہے اس کے باوجود عجلت میں تراشے گئے مصرعوں کے درمیان یہ امید قائم ہے کہ وہ کچھ دیر ٹھہر کر اور سوچ کر قلم اٹھانے کی روش اپنائیں گے تا کہ ہجوم میں ان کی شناخت کا عمل آسان ہو سکے"۔

وہ نامور ادیبوں کی یہ قیمتی آرا اپنی اپنی جگہ قابلِ غور ہیں، لیکن مجموعی طور پر مجھے اسلم سحاب کی شاعری میں وہ "سپارک" دکھائی دے رہا ہے جو وقت اور عمر کے مزید مراحل گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیقی توفیقات کو مزید زرخیزی اور موضوعات کی عمدہ ٹریٹمنٹ کے ساتھ اظہار پر قدرت بخشے گا۔ اس تناظر میں ان کی کتاب کے چند عمدہ اشعار ملاحظہ ہوں جو ان کے امکانات کی پیش گوئی کرتے ہیں:

مجھے کاشانۂ غربت ہے تاجِ بادشاہی
غریبی میں مزاج اپنا شہانہ لکھ دیا ہے

باطن کو ایک نور کی چادر کرو عطا
تب اک سحر کا دیپ جلاتی ہیں کھڑکیاں

اِک بغاوت سی رُتوں سے عیاں ہوتی ہے
زندگی تیغ سے تسخیر کہاں ہوتی ہے

ہر صفحے پہ مسطور ہے جلوہ کوئی
وحدت کے سب اسرار و معانی طے شُد

محمل کا ہٹایا ہے ہَوا نے پردہ
دیوانوں کی آشفتہ بیانی طے شُد!

نیل میں اِک دن تمھیں ہے ڈوبنا
اے فراعینِ زمانہ، دیکھنا!

....

مصنف کی کتاب دوستی کا مثبت پہلو اُن کے اس شعر سے عیاں ہوتا ہے:

پڑھ کے بسم اللہ اُٹھا لینا متاعِ علم کو جو ملے تجھ کو کوئی فٹ پاتھ سے اچھی کتاب ان کا یہ شعران کے تخلیقی تنوع کی دلالت کر رہا ہے:

گیت، رباعی اور غزل
خواب شجر کے سارے پھل

تاہم "خواب شجر" میں اسلم سحاب ہاشمی کی صرف غزلیں شامل ہیں اس لیے ہمیں ان کے گیتوں، رباعیات اور دیگر شعری اصناف پر مشتمل کلام کے لیے اگلے مجموعے تک انتظار کرنا پڑے گا۔ تب تک ادبی ذوق رکھنے والے قارئین یہ کتاب ناشر انورسن پبلشرز، ساہیوال یا ادبی مرکز مسند، فرید ٹاؤن ساہیوال سے صرف ۵۰۰ روپے میں حاصل کر سکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

چراغِ افکار کی ضوفشانیاں اور ڈاکٹر مقصود جعفری

صوفیائے کرام کے یہاں معرفتِ باری تعالیٰ کے حصول کے لیے نفس کُشی اور نفیِ ذات کا التزام لابدی ہے، جس کی کئی ایک صورتیں ممکن ہیں، لیکن ہر وہ کام جو نفس کے برخلاف ہو، کارِ دارد ہے۔ یہی صورتِ حالات مجھے درپیش ہے۔ جب ڈاکٹر مقصود جعفری ایسے شاعرِ ہفت زباں، پروفیسر، محقق اور دانشور کی قدآور شخصیت کا تذکرہ مقصود ہو، جنھوں نے نصف صدی پر محیط اپنی زندگی کے بہترین ماہ و سال تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف اور اپنی علمی و فکری بالیدگی کے جلو میں گزارے ہیں تو مجھ ایسے شخص کے لیے گفتگو کرنا گویا نفس کُشی کے مراحل سے گزرنا ہے۔ پھر اس پر مستزاد قیدِ وقت و موضوع نفس کُشی سے بھی آگے کا کوئی مرحلہ ہے، تاہم میری کوشش ہوگی کہ میں اس ذمہ داری سے حتی المقدور عہدہ برآ ہو سکوں۔

یہ مبالغہ آرائی نہیں بل کہ احوالِ واقعی کا بیان ہے کہ موضوع کی پابندی اور وقت کی تنگ دامانی اس لیے بھی شدید دشواری کا باعث بنتی ہے کہ گفتگو کو مبہم ہونے کی حد تک مختصر کرنا پڑتا ہے، جس کے نتیجے میں موضوع تشنہ اور بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ خاص طور پر جب ڈاکٹر مقصود جعفری ایسی ہمہ جہت ادبی شخصیت پر گفتگو کرنا مقصود ہو۔ چناں چہ جعفری صاحب کے جملہ خصائص اور درجہ ہائے فضیلت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے میں اپنی گفتگو فقط "چراغِ افکار" تک محدود رکھنے کی اپنی سی کوشش کروں گا، اگرچہ یہ موضوع کے عُمق و وسعت کے تناظر میں ایک تفصیل طلب مرحلۂ شوق ہے۔

"چراغِ افکار" ڈاکٹر صاحب کے کالموں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب 438 صفحات پر محیط ہے، جس میں پیش کردہ مجموعی کالموں کی تعداد 94 ہے، گویا اگر مزید 6 کالم ہوتے تو 100 کا عدد پورا ہو جاتا۔ کتاب کے سرورق میں ایک چراغ کی لو بلند ہو کر مختلف جرائد و اخبارات کے ذریعے ابلاغ کے روشن پہلو کو اُجاگر کرتی نظر آتی ہے، جو افکار کی بالیدگی کا

نثار ترابی

ایک بلیغ استعارہ پیش کرتی ہے۔

جہاں تک پسِ ورق کا تعلق ہے، اگر عام قاری کے نکتہ نظر سے دیکھا جائے، جو بوجوہ ڈاکٹر مقصود جعفری صاحب کی شخصیت سے واقف ہے، تو بھی اُس کی نظر جوش ملیح آبادی، سید ضمیر جعفری، احمد فراز اور ڈاکٹر جاوید اقبال ایسے قدآور مشاہیر کی آرا سے معنوی طور پر ہم رشتہ نہیں بھی ہو پاتی ہے تو بھی ان کے تعارف کے اساسی مرحلے کی منزل تک تو ضرور آجاتی ہے۔ ادب کے نئے دیوانوں کے لیے مرحلۂ شوق کی یہ ہم قدمی بجائے خود قابلِ صد افتخار ہی نہیں بل کہ مشاہیر کی جانب سے تحسین کے یہ زاویے دیگر اہلِ علم کے لیے بھی ڈاکٹر صاحب کے فکروفن کی جملہ جہات کو سندِ قبولیت بخشنے کے لیے کافی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی کتاب میں موجود کالموں کی درجہ بندی کی جائے تو ان میں سے کچھ تو شخصیات کے تعلق سے قلم بند کیے گئے ہیں، جن میں مولانا رومی، فیض، سردار عتیق اور میرواعظ عمر فاروق، آصف نشاط، احمد فراز، بابا فریدالدین مسعود، سفیرِ پاکستان، دو وزرائے اعظم، ڈاکٹر جاوید اقبال، محمود علی، ایوب خان، ڈاکٹر شمس جیلانی، شارون مارگوس، علامہ اقبال، فاطمہ جناح، صلاح الدین ناصر اور ذوالفقار علی بھٹو شامل ہیں۔ شخصیات پر لکھے گئے ان کالموں میں تین وصف نمایاں ہیں: پہلا یہ کہ عمومی ادبی چاشنی، دوسرا داستان گوئی اور تیسرا ڈاکٹر صاحب کا مخصوص اسلوب۔ یہ سب مل کر انھیں خاصے کی چیز بناتا ہے، جس میں اس کی مقصدیت غالب رہتی ہے۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کے کالم بہ عنوان "علامہ اقبال درگاہِ فاطمہؑ پر" کی عقیدت آسا کلیاں پیش کرتا ہوں:

رشتۂ آئینِ حق زنجیرِ پاست
پاسِ فرمانِ جنابِ مصطفیٰ است

ورنہ گردِ تربتش گردیدمے
سجدہ ہا برخاکِ او پاشیدمے

ان اشعار کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ:

"آئینِ حق میرے پاؤں کی زنجیر ہے اور جناب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کا مجھے پاس ہے، نہیں تو میں ساری عمر (آپ) یعنی سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی قبر کے گرد طواف کرتا رہتا اور اس (قبر) کی مٹی پر سجدے نچھاور کرتا رہتا"۔

قارئین کرام! جعفری صاحب کا علامہ اقبال کی مذکور نظم پر لکھنے کا مدعا و مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ اس دورِ غفلت و شیطنت میں ہماری توجہ اس طرف رہنی چاہیے کہ ہماری بیٹیوں کی آنکھیں مغربی چکاچوند کو دیکھ کر خیرہ نہ ہوں، بل کہ خاتونِ جنتؑ کی سیرت پر عمل پیرا ہوں۔ بہ قول اقبال:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

کتاب میں ڈاکٹر مقصود جعفری کے شامل کیے گئے دیگر کالم موضوعاتی ہیں، تاہم ایک روایتی ادبی نقاد کو ڈاکٹر صاحب کے فکروفن پر ادبی تنقید کرنے میں مشکل کا

سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ قاعدہ اور کلیہ رواج پا رہا ہے کہ کسی بھی شخص کو ہم اولاً اس کے خیالات اور افتادِ طبع کی بنیاد پر حقیقت پسند، ترقی پسند، رومانی، فکاہی، قدامت پرست، جدیدیت کا علمبردار، ملا، دہریہ، صوفی، ملحد وعلیٰ ہذالقیاس کسی نہ کسی خانے میں سجا کر دوسروں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور پھر عموماً اس کی قلمی کاوشوں میں سے حسب منشا فقط یک رخی دلائل تلاش کر کے اِس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ یوں بزعم خویش ہمارا تحقیقی فرض پورا ہو جاتا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کا خاصہ ہے کہ ان کے موضوعات کا تنوع ہی ایسی کسی کوشش کی راہ میں دیوار ہے۔ چند موضوعات ملاحظہ ہوں:

”میرا کتبہ، قبر، دماغ اور دولت، دو انتہائیں، شاعری اور زندگی، ماں کی بددعا، شاعر اور شراب، حیوان اور انسان، تصوف اور امن، سرمایہ پرستی کا سفینہ، انتخاب یا انقلاب، مذہبی رواداری، معراجِ انسانیت، پلاٹوں کی سیاست، پاکستانی سیاست دانوں کے تین کھیے، غلامی ایک لعنت، ذہنی بدہضمی کا نتیجہ، مجھے پڑھو وغیرہ“۔

یہ کہنا تو شاید مبالغہ ہوگا کہ ڈاکٹر مقصود جعفری بجائے خود ایک دبستان ہیں، تاہم اِس دعوے کا اقرار ممکن ہے کہ ان کی تحریروں میں اسلوب و نظریات کا جو مخصوص رنگ جھلکتا ہے اُس کے مجموعی تاثر سے ادب کے ترقی پسندانہ دبستان سے اُن کی شیفتگی بہ ہر طور نمایاں ہو جاتی ہے۔ یا پھر دوسرے لفظوں میں معتدل درجے کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں فکر و خیال اور نظریات و خیالات کی سطح پر ایک ایسے دبستان کی جھلک ضرور ملتی ہے، جس کے باطن میں ادب دوستی سے زیادتی انسان دوستی کا تصور اساسی نوعیت رکھتا ہے۔ انقلاب و رومان کی ملی جلی گنگا جمنی کیفیت کا حامل یہ دبستانِ فکر و خیال حضرت جوش سے آغاز ہو کر اقبال، فیض، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، مجاز، اختر شیرانی اور احمد فراز سے ہوتا ہوا اُن کے شاعرانہ ذوق کا ہم نوا بنتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اِس تازہ فکری کاوش کے مرکزی خیال کا دائرہ احساس، ادب کی مقصدیت کا تصور اُجاگر کرتا ہے۔ اس کے ذریعے ”آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی کی“ وہی عملی تفسیر، صداقت کا استعارہ بن کر اُبھری ہے جو اُن کی ہر تصنیف کا خاصا رہا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے کہا تھا:

دروغِ مصلحت آمیز جب عروج پر ہو
تو آس پاس کہیں چیختی ہے سچائی

....

بھی یا کم از کم اس سے ملتی جلتی صورت حالات ان کی تحریروں کا اختصاص ہے۔ تمام مکاتب فکر کے ہاں کچھ نہ کچھ قابل کسب و اختیار ہوتا ہے، مگر معیاری توازن اور مبالغہ سے گریز کی پابندی کے ساتھ کالموں کا یہ تسلسل بیانیہ طرز فکر، کا حامل بھی بن سکتا ہے اور نئی نسل کے قارئین کے لیے ادبی فکری تناظر میں ایک مشعلِ راہ کی حیثیت بھی اختیار کر سکتا ہے۔

خوشی تو اس بات کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس طرز اسلوب و فکر کی حامل مزید کوئی تصنیف سامنے لائیں بھی یا نہیں تاہم مقصدیت سے آشنا ان کے والہانہ ادبی حوصلوں کی جوانی باعثِ اُمید ضرور ہے۔

☆☆☆☆☆☆

محمد افتخار شفیع کی مرتبہ ”کلیات مجید امجد“

نجیب جمال

اردو نظم میں یہ گنجائش ہمیشہ سے تھی کہ وہ ہر لحظہ بدلتی زندگی کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ اردو شاعری کا گذشتہ سات صدیوں کا سفر تمام تر اردو غزل کا مرہون منت رہا ہے اگرچہ شاعری کی دیگر اصناف قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور شہر آشوب نے بھی مقدور بھر ساتھ نبھایا مگر مجید امجد کی نظم ”طلوع فرض“ کی ان دو لائنوں کے مانند کہ:

”غبار راہ نے کروٹ بدلی ، جاگا اٹھا ، اک دو قدم تک ساتھ بھاگا

.....

پھر انیسویں صدی کے آخر میں اردو نظم نے انگڑائی لی، جاگی اور اپنی ہیت کے تنوع کے باعث موضوعات کی طرفگی کی نمائندہ ٹھہری۔ یہی نہیں بلکہ بیسویں صدی میں بھی سیاسی و سماجی رویوں کا لمحہ لمحہ اظہار کرتی رہی۔ بیسویں صدی انقلابات، تغیرات، تحریکات اور متنوع رجحانات کی صدی تھی ان سب تبدیلیوں کو معاصر زندگی سے ہم آہنگ کر کے نظم ہی بہتر طور پر بیان کر سکتی تھی اور اس نے یہی کیا بل کہ غزل کے روایتی موضوعات میں تبدیلی کا سبب بھی بنی بیسویں صدی میں اس کی نمود سب پہلے یگانہ کی غزل میں ہوئی جسے اینٹی غزل کے تجربے کا نام دیا گیا۔ اردو نظم میں راشد، میرا جی، فیض، اختر الایمان ، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی جیسے معاصرین کی موجودگی میں مجید امجد کی نظم نے ”ہر عقدہ تقدیر جہاں“ کو اوروں سے بڑھ کر کھولا۔

مجید امجد کا میری عملی زندگی میں ایک خاص کردار رہا ہے۔ میں ایم اے اردو کا امتحان دے رہا تھا، جن دنوں ان کا انتقال ہوا۔ ان کا انتقال جن حالات میں ہوا، جس طور ان کی تدفین کے مراحل طے ہوئے اور جس طرح اس وقت کے ساہیوال کے ڈپٹی کمشنر جاوید قریشی جو خود بھی شاعر تھے، نے ایک کمیٹی تشکیل دے کر مجید امجد کے غیر مطبوعہ کلام کی بازیابی کی اور اس کی طباعت کے

لیے کوششوں کا آغاز کیا اس نے مجھ ایسے اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کو تیزی سے مجید امجد کی شاعری کی طرف متوجہ کیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ''شبِ رفتہ کے بعد'' (1976) کی اشاعت پر ''مجید امجد اور میں'' کے عنوان سے ایک مضمون بھی لکھا تھا جو ادبی رسالہ ''فکرِ نو'' ملتان میں شائع ہوا تھا۔

پبلک سروس کمیشن میں اردو کا لیکچرار منتخب ہونے کے لئے انٹرویو دینے لاہور گیا تو وہاں بھی مجید امجد کی آخری دور کی نظموں کے آہنگ پر سوال ہوا، حسنِ اتفاق سے میں پی ٹی وی پر یوسف کامران کا مجید امجد سے لیا گیا انٹرویو دیکھ چکا تھا جس میں خود مجید امجد نے اپنی نظموں میں ہندی چھند اور پنگل کے حوالے سے عروضی آہنگ کی وضاحت کی تھی لہذا میرا کام بھی بن گیا پھر ملتان یونیورسٹی (بہاالدین زکریا یونیورسٹی کا نام بعد میں دیا گیا) کے سلیکشن بورڈ میں مجید امجد کی نظم ''آٹوگراف'' پر سوالات ہوئے میں ان دنوں ''آٹوگراف'' کے علاوہ بھی کئی نظمیں ''کنواں''، ''پنواڑی''، ''منٹو''، ''طلوعِ فرض''، ''توسیعِ شہر'' ازبر کیے پھرتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ وزیر آغا، مظفر علی سید اور سہیل احمد خان کے تنقیدی مضامین بھی پڑھ چکا تھا۔ خاص طور پر وزیر آغا کا مضمون ''مجید امجد: توازن کی ایک مثال'' کی ان دنوں بڑی دھوم مچی ہوئی تھی۔ بس پھر کیا تھا ہم نے بھی اوول کے نیلی آنکھوں والے ہیرو جس کے حروف کج تراش کی کھینچی ہوئی لکیروں سے بیاضِ آرزو بکف حسیناؤں کے لبوں پر مسکراہٹیں تھم سی گئی تھیں، زرنگار پلوؤں سے جھانکتی کلائیوں کی تیز نبض رک سی گئی تھی اور حسین کھلکھلاہٹوں کے درمیاں وکٹ گر چکی تھی، تحسین میں پورا قصیدہ پڑھ ڈالا۔ بھلا مجید امجد کے بارے میں اتنا جاننے والے کا بھلا کیوں نہ ہوتا۔ آج بھی جب پچاس سالہ تدریس کے آغازِ سفر کو پلٹ کر دیکھتا ہوں تو سوچ کی دہلیز پر اپنے دوشِ غم پر گلیم اوڑھے نشیبِ زینۂ ایام پر عصا رکھتا ہوا مجید امجد کھڑا نظر آتا ہے اور پھر اس کے بعد تو جیسے بے نمود بھی اتنا نمودار ہونے کا ایک رواں سلسلہ ایسا ہے کہ بس۔ یوں تو مجید امجد کے طلوع ہونے کا یہ سلسلہ 1958 میں ''شبِ رفتہ'' کی اشاعت کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا مگر اب چھیاسٹھ سال کے بعد تو نصف النہار تک پہنچ چکا ہے جس کی جدید ترین صورت محمد افتخار شفیع کا مرتب کیا ہوا ''کلیاتِ مجید امجد'' ہے۔

مجید امجد کے مکمل متن کی تلاش کا یہ سفر ہنوز جاری ہے۔ جاوید قریشی، حنیف رامے، سجاد حیدر جیسے اقتدار کے ایوانوں کے مکین بھی اس کا وسیلہ رہے ہیں اور عبدالرشید، امجد اسلام امجد، افتخار جالب، سعادت

سعید، فہیم جوزی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، اسرار زیدی، سجاد میر جیسے ادب شناسوں نے ''شب رفتہ کے بعد'' کی اشاعت کو ممکن بنایا تھا۔ تلاش کا یہ سلسلہ ابھی رکا نہیں۔ تاج سعید، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، شمیم سیال، محمد امین، ساحل احمد نے باقیات کی صحتِ متن پر توجہ دی۔ ''لوحِ دل'' (مرتبہ تاج سعید) اور ''کلیاتِ مجید امجد'' (مرتبہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا) جیسی دو اہم اشاعتیں سامنے آئیں۔ ''کلیات مجید امجد'' کو بہر صورت تفوق حاصل رہا کہ متن کی تصحیح اور ترتیب میں خواجہ محمد زکریا نے خصوصی درک سے کام لیا یوں وقت گزرنے کے ساتھ مجید امجد فہمی کے حوالے سے جتنا کام ہوا اتنا ان کے معاصرین شعرا پر دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ تو طے ہے کہ بڑے شاعر کی تفہیم کا عمل مسلسل تلاش، تحقیق، تنقید اور تدوین کا محتاج ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ مجید امجد اب کسی ایک مضمون کا موضوع نہیں بلکہ مستقل کتابوں کا موضوع ہے۔ مجید امجد کی شاعری جو بتدریج اپنے امکانات واضح تر کر رہی ہے اس کا تقاضا ہے کہ مجید امجد کا مکمل کلام نہ صرف یکجا ہو بلکہ متن کی زمانی ترتیب بھی مستند حوالوں کے ساتھ مدوّن ہو:

''یہ ایک خواب سہی پھر بھی ہو تو سکتا ہے''

اور جواں سال محمد افتخار شفیع نے اس خواب کی تعبیر عملی طور پر ''کلیات مجید امجد'' کی صورت پیش کر دی ہے۔

محمد افتخار شفیع کا مرتب کردہ ''کلیاتِ مجید امجد'' ایک مستند دستاویز کی صورت مجید امجد کی پچاسویں برسی کے موقع پر یادگاری ایڈیشن کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ مجید امجد کی وفات سے ایک سال قبل وجود میں آنے والے طباعتی ادارے بک کارنر، جہلم کے ناشرین گگن شاہد اور امر شاہد نے اسے نہایت دیدہ زیب اور شایانِ شان انداز میں شائع کیا ہے۔

محمد افتخار شفیع نے ''کلیاتِ مجید امجد'' کی تدوین میں جس حسنِ عمل اور حسنِ ترتیب سے کام لیا ہے اس کی داد تو دی جاتی رہے گی۔ سر دست یہ کہنا موزوں ہوگا کہ کلیات کی تدوین میں حسنِ صورت کے ساتھ ساتھ حسنِ معاملات اور حسنِ تدبیر کی صورت بھی پیدا کی گئی ہے اور یہ سب محمد افتخار شفیع کے دستِ ہنر مند کے باعث ہو سکا ہے۔ ان کے پیشِ نظر مجید امجد کے مکمل کلام کی جمع بندی کرنے، ترتیب دینے اور تدوین کرنے کی اب تک کی کاوشوں کا مرتب دفتر پہلے سے موجود تھا۔ لہٰذا اس کے ہوتے ہوئے یادگاری ایڈیشن کی ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے اپنی الگ راہ نکالنے کا دشوار مرحلہ بھی طے کرنا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ ''فکرِ خودسوز کے لہو سے لتھڑے یہی چند اوراق'' تمام تر ''بیانِ نامکمل'' اور

''اظہارِ ناتمام'' کے باوجود فن کی بلندیوں تک پہنچ سکیں جو مجید امجد کا مقصود نظر تھا۔ مجید امجد نے ''شبِ رفتہ'' کے دیباچے میں لکھا تھا:

''میں اسی ذوق طلب کا مارا ہوا، کانپتے اور جھجکتے حروف کے یہ سفینے آج وقت کی لہروں کے حوالے کرنے آیا ہوں''

کلیات کی تدوین کو دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ محمد افتخار شفیع نے مجید امجد کی اسی خواہش کو حرزِ جاں بنا کر وقت کی لہروں پر بہتے ہوئی ان کی شاعری کی سفینے کو ساحلِ مراد تک پہچانے کی کامیاب کاوش کی ہے۔ اس کلیات کی کچھ بنیادی خوبیوں کا تذکرہ بھی ضروری ہوجاتا ہے:

1- محمد افتخار شفیع نے پہلے سے موجود مرتب مجموعوں اور کلیات سے سوا کلام کی ایک ایسی ترتیب قائم کردی ہے جو خاص طور پر ذہنِ جدید کے لیے قابلِ قبول ہو۔

2- محمد افتخار شفیع اس سے پہلے مجید امجد کی نثر کی کلیات مرتب کر چکے تھے۔ ان کی یہ ریاضت ہی کلیات میں کسبِ فن کا ذریعہ بنی ہے۔

3 - کلیات میں متنی تحقیق سے سوا متنی تدوین، تنقید اور تجزیے جیسی مشکل کا سامنا بھی تھا جسے محمد افتخار شفیع نے حسنِ تدبیر سے سہل بنا دیا ہے۔

4- کلیات کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ متن کا تقابل کر کے مصرعوں کے اختلافات کو واضح کیا ہے اور مستند متن تک پہنچنے کی سعی کی گئی ہے۔

5- کلیات میں نظموں کی الگ اور غزلوں کی الگ ترتیب قائم کی ہے۔ یہ ترتیب مجید امجد کے ذہنی، فکری اور فنی ارتقا کو سمجھنے میں زیادہ معاون ہوگی۔

6 - کلیات کے تمام حوالے، حواشی، تعلیقات اور فرہنگ اپنی اپنی جگہ کتاب کی اہمیت کو دو چند کرتے ہیں۔

7- کلیات کے آخری حصے میں شامل چند باقیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سہرے بھی لکھے اور ہجویہ اشعار کہنا بھی ان کے مشاغل میں شامل تھا۔ کلیات میں شامل ان منظومات سے مجید امجد کے بارے میں کچھ تحفظات کی نفی ہوتی ہے۔

8- ''مجید امجد کی کہانی'' میں ان کی تنہائی، علیحدگی، اکیلے پن اور بیگانگی کا تجزیہ خوبی سے کیا گیا ہے۔

9 - نظموں کے ماخذات کی بحث بھی دلچسپ ہے۔

''کلیاتِ مجید امجد'' کی اشاعت پر اس کے مدوّن محمد افتخار شفیع اور ناشرین گگن شاہد اور امر شاہد (دل پذیر اشاعت کے لیے) مبارک باد اور حرفِ تحسین کے بجا طور پر سزاوار ہیں۔

☆☆☆☆☆

حامد یزدانی کے شعری مجموعے ''ہم ابھی رستے میں ہیں'' پر ایک نظر

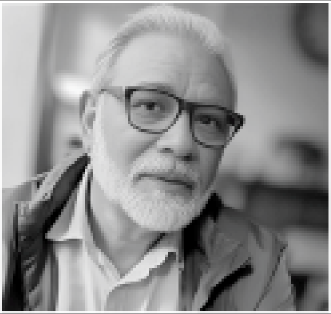

حال ہی میں جناب نوید صادق کے توسط سے حامد یزدانی کا مجموعہ کلام ''ہم ابھی رستے میں ہیں'' موصول ہوا جس میں اردو نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔

یہ شعری مجموعہ چھپے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا۔ اس کا انتساب خالد احمد، سراج منیر اور جناب ڈاکٹر خورشید رضوی کے نام ہے۔ کتاب خوب صورت سرورق کی حامل ہے اور اس کی ابتدا میں ہی ممتاز شاعرہ محترمہ شاہدہ حسن کا خوب صورت تعارفی دیباچہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ اس کے علاوہ خود شاعر نے بھی اپنی ذات اور نظریات کا کچھ احوال رقم کیا ہے۔ کتاب کے بیک فلیپ پر جناب غلام حسین ساجد، نسیم سید اور نوید صادق کی معتبر آرا بھی پیش کی گئی ہیں۔

کتاب ہاتھ میں آتے ہی میں نے سب سے پہلے جناب یزدانی جالندھری کو یاد کیا کیونکہ حامد یزدانی اور ماجد یزدانی کا نام سنتے ہی ان کا چہرہ نظر میں آ جانا فطری سی بات ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں 1986 میں بسلسلہ تعلیم لاہور میں وارد ہوا تو وہاں طفیل ہوشیار پوری، انجم رومانی، شہرت بخاری اور یزدانی جالندھری اپنی نوکلاسیکی شاعری کے باعث مقبول شعرا میں شمار ہوتے تھے اور کم و بیش ہر ادبی پرچے میں ان کا کلام پڑھنے کو ملتا تھا۔ 90 کی دہائی میں یہ کہکشاں آہستہ آہستہ غروب ہوتی چلی گئی۔ تاہم یزدانی جالندھری کے صاحب زادوں نے ادب پروری اور تخلیق کاری کا یہ پرچم اب تک اٹھایا ہوا ہے اور اب تو خیر حامد یزدانی کا شمار بہت سینئر شعرا میں کیا جاتا ہے۔

احباب جانتے ہیں کہ حامد یزدانی کا تعارف لاہور سے ہے اور کتاب پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ان کی شاعری میں بھی

رحمان حفیظ

لاہور سے محبت رچی بسی ہوئی ہے ان کے کلام میں جا بجا لاہور کا تذکرہ ملتا ہے اور یہ حال غزلوں اور نظموں میں یکساں دکھائی دیتا ہے۔ حتیٰ کہ لاہور کے اور گلی کوچوں جیسے مزنگ، مال روڈ، گلی نمبر 40 کے علاوہ اس کے قہوہ خانوں اور فٹ پاتھوں تک کی یادیں کلام میں جھلکتی دکھائی دیتی ہیں۔

خالد احمد پر لکھے گئے اس شعر نے تو مجھے آبدیدہ کر دیا:

کشش وہ لاہور کے ٹھکانوں میں اب نہیں ہے
کہ ایک خالد بھی چائے خانوں میں اب نہیں ہے

....

حامد یزدانی نظم کے بہت طاقتور شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں انتہائی گہرے مناظر کی پینٹنگز کی طرح ہیں۔ انھوں نے دلکش مناظر بھی پینٹ کیے ہیں۔ لیکن مجھے ان کی نظموں میں تنہائی، وحشت، خوف اور اس قسم کی کیفیات کا عکس زیادہ نظر آیا اور رومانویت کم کم دکھائی دی۔ ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ یادوں پر مشتمل ہے۔ دراصل حامد یزدانی نے اس کتاب میں اپنی زندگی اور اپنے عہد کو محفوظ کر دیا ہے اور اس میں سب سے زیادہ قصہ لاہور کا رقم ہوا ہے اور لاہور سے وابستہ شخصیات کا ان میں کچھ گزشتگان بھی ہیں جیسے صادقین، اختر حسین جعفری، خالد احمد، ناہید شاہد، جاوید انور، اسلم کولسری، خالد علیم اور کئی دوسرے۔

حیات لوگوں میں خورشید رضوی، علی اصغر عباس، ضیاالحسن، حمیدہ شاہین، عباس تابش اور کئی دوسرے احباب کی محبتیں شامل کتاب ہیں۔ ڈاکٹر توصیف تبسم پر لکھی گئی ایک خوب صورت نظم اس کتاب کا خاص حوالہ ہے اور اس شعری مجموعے کا نام بھی اسی نظم کے نام پر رکھا گیا ہے۔

کہیں کہیں بالواسطہ احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، حبیب جالب، امجد اسلام امجد اور دیگر سینئرز کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ چائے خانوں، ادبی دفاتر اور جرائد کو بھی وہ نہیں بھولتے۔ ان ناسٹیلجک موضوعات کے علاوہ شاعر نے کہیں کہیں عالمی، قومی اور ملی مسائل پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ تاہم انفرادی زندگی اور اس سماجی اور نفسیاتی پہلوؤں پر ان کی بیسیوں نظمیں زیادہ اہم ہیں۔

لیکن جہاں جہاں انھوں نے فطرت اور مظاہر فطرت پر لکھا ہے وہاں جادو بیانی کی منزل تلک پہنچے ہیں۔

المختصر یہ کہ ان کی مجاز نگاری قاری کو مسحور کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔ نظموں کی چند متنوع سطور ملاحظہ کیجئے:

ستارہ تھا
اسے تو روشنی ہی گنگنانا تھی
وہ خوابوں کی کہانی میں جھلکتی جھیل کا
جھلمل کنارہ تھا
پرانے راستوں میں ایک نئی آہٹ کا کھلتا
استعارہ تھا
(نظم: اسے تو روشنی ہی گنگنانا تھی)

....

ابھی وقت کی کوری چادر لپٹنے میں کچھ دیر ہے
شہر زندہ ہے، کہنے کو رنگین ہے
کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہے
اندر سے غمگین ہے
(نظم: تم بہت برے ہو)

....

حامد یزدانی کی بڑی قوت ان کی امیجری ہے اور انھوں نے اس کا بھرپور استعمال غزل اور نظم دونوں میں کیا ہے۔ تاہم نظموں میں ان کی قیمت دوچند ہے۔
میں شامل کی گئی ہیں:
صدیوں سالوں مہینوں موسموں اور تہواروں پر لکھنا حامد یزدانی کو بھلا لگتا ہے۔ اس حوالے سے نئے سال کے نام، رفتہ صدی کی آخری شام، نئی صدی، ہیلووین اور ایک بوڑھے اگست کا قصہ ان کی اہم نظمیں ہیں۔ وقت کے ان مرحلوں کو اپنی امیدوں اور حسرتوں کے ساتھ منسلک کر کے پیش کرنا ان کا کمال ہے۔

تاہم بعض معروف و مشہور عالمی مقامات جیسے مین ہیٹن، پین سلوانیہ، نیویارک، نیاگرا اور بہت سے دوسری جگہوں کے بارے میں بھی خوب صورت نظمیں کتاب میں شامل ہیں اور کئی اہم سوالات کو سامنے لاتی ہیں۔

غزلوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں لیکن دل کش ہیں۔ ان میں چھوٹی اور متناسب بحروں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ بعض کم مستعمل یا کچھ تصرفات کی حامل بحریں بھی حامد یزدانی کو بھائی ہیں۔ ان تمام غزلوں کا جوہر خوب صورت جذباتی کیفیات ہیں جنھیں بہت سادہ کاری لیکن شستہ بیانی کے ساتھ منظوم کیا گیا ہے۔ ان کا انداز روایت سے قریب تر ہے مگر ثقالت سے بالکل پاک۔ نئے دور کی سہل اور صاف زبان استعمال کی گئی ہے۔

ان کا شعری مزاج کومل، شائستہ اور تمثالوں سے بھرپور ہے۔ مجموعی طور پر یہ

شاعری پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے اور
میں نے اس کتاب کے ساتھ بہت اچھا
وقت گزارا۔

یہ اشعار اس کی گواہی ہیں:

دبک کے خیمہ نسیاں میں بیٹھ رہتے ہیں
ہم اس کی یاد بھری بارشوں سے ڈرتے ہوئے

عہد رفتہ کے شکستہ عکس کی تکرار ہوں
تم سمجھ بیٹھے ہو کوئی آئنہ خانہ مجھے

کھولتا ہوں شب کی جب کھڑکی تو نیلے صحن میں
چاند ایک رکھا ہوا ملتا ہے روزانہ مجھے

چراغ خاموشی تھا اور میں بھی
سر بام نوا رکھا ہوا تھا

وہ جس ورق سے ہمیں بنانا تھی ایک کشتی
اس ایک ورق پر کئی سمندر بنا لیے تھے

کیسے ترتیب وار بجھتے ہیں
ہے کوئی رابطہ چراغوں میں

خوش ہوں اس بار بہت سوچ سمجھ کر مجھے چھوڑا
یاد ہے پہلے تو انجانے میں تم چھوڑ گئے تھے

اٹھیں گے ایک دن سوال بن کے دوستو
جو سر ڈھلک گئے ردا کے انتظار میں

اگر ملنا تمہارا وہم سا تھا
بچھڑنا بھی تمہارا خواب سا ہے

ٹھہر تو جاؤں سر مرگ دو گھڑی میں بھی
مگر جو پیچھے میرے زندگی پڑی ہوئی ہے

کوئی تھکن بھی نہ تھی یوں ہی موج میں آ کر
یہاں زمیں تو وہاں آسماں اتار دیا

دھرتی نہیں ہے پاؤں کے نیچے یہ دھند ہے
نیلا دھواں ہے سر پہ میرے آسمان نہیں

سخن سے پار اترنا محال تھا حامد
سفر طویل تھا کشتی تھی کاغذی میری

پیچھے ہٹ جانا بھی پسپائی نہیں
شق ہے معرکہ آرائی نہیں

چھپ کے جو دن کے جھروکے میں مجھے دیکھتا ہے
وہ کسی اور کے دھوکے میں مجھے دیکھتا ہے

رات بھر رہتی ہے مجھ کو مرے سائے کی تلاش
ڈھونڈتا رہتا ہے مجھ کو میرا سایہ دن بھر

ڈوبتے ڈوبتے کھلا ہم پر
بادباں کتنا خوب صورت ہے

ٹھہری ہوئی یادوں کا سفر ڈھنگ سے کرتے
یہ شغل بھی اچھا تھا اگر ڈھنگ سے کرتے

ہوتا وہی لاہور، وہی چائے، وہی دوست
ہم لوگ کوئی شام بسر ڈھنگ سے کرتے

☆☆☆☆☆

فصیلِ متن پہ جھنڈے ہیں استعاروں کے

''گمشدہ آوازوں کا تعاقب'': کچھ تاثرات، کچھ محسوسات

مجھے یہ مصرع زویا حسن کے افسانوں پر مشتمل کتاب پڑھنے کے بعد بے ساختہ سا سوجھ گیا۔ سو، اسی کو اپنی تحریر کا عنوان بنانا اچھا لگا۔

زویا حسن ان خوش قسمت لکھاریوں میں شامل ہو گئی ہیں۔ جن کی پہلی کتاب بغیر کسی خاص تگ و دو کے مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ پڑھنے کے بعد میرے لیے ایسی رائے قائم کرنے کا ٹھوس جواز بنتا ہے۔ پندرہ افسانوں پر مشتمل اس مجموعے کا نمایاں ترین وصف یہ ہے کہ اس میں خال خال ہی راست بیانیے کا انداز اپنایا گیا ہے اور یہ جدید فکشن نگاری کا بنیادی اصول اور کسی حد تک کڑی شرط بھی ہے۔ اس طرح کے اسلوب کو سنجیدہ قاری یا نقاد کبھی بھی رسماً پڑھ کر عمومی سا تبصرہ خواہش کے باوجود نہیں کر سکتا کیونکہ ''صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں'' کا ماحول پیدا ہو جائے تو قاری کے لیے متن کی قرات حلِ متن مزید کا سماں پیدا کرتی ہے اور دل و دماغ کو ایک ہی طول و عرضِ فکر کے منطقے میں رکھ کر مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔

زویا کے افسانوں میں زبردست ناسٹلجیا، زمانی گرفت سے آزاد ہونے کی سر توڑ سعی/ آئیڈیل سعیِ لاحاصل سے پیدا شدہ خلش، تجسیم نگاری، تجسس و تحیر، کشمکش / conflict اور طنز سمیت بھی وہ لوازمات شامل ہیں جو اصل میں تو راست انداز میں لکھی گئی کہانیوں کے لیے مختص ہیں۔ پھر ان افسانوں کا امتیازی وصف یا شناختی نشان کیا ہے کہ یہ جدید اردو نثری ادب میں اپنی پہچان کرا سکیں؟ شاید جواب بہت مختصر بھی ہے اور شاید اسی بظاہر مختصر جواب کے اندر ہی زویا کے افسانوی جہان کی کئی جھلکیاں دکھائی دے جائیں:

علامت آمیز استعاراتی نظام یا استعاروں تشکیل پاتی علاماتی کہکشاں جس میں کچھ ستارے بے حد روشن، کچھ قدرے مدھم اور کچھ پیہم ٹمٹمانے میں مصروف و مست۔

افتخار الحق

جی ہاں احباب! میری تجزیاتی قرأت کا نتیجہ یہی ہے اور اسے ثابت کرنے کے لیے کئی معتبر شہادتیں بھی میرا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ مثلاً پہلے افسانے (جو کتاب کے عنوان سے معنون ہے) سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"تمھاری آواز اگلی نسلوں کے کانوں کی تلاش میں نکلی ہے میرے لال، صرف انھی کو سنائی دے گی کیونکہ وہ اس مرکز سے بچھڑ گئی تھی جہاں وہ سنی جاتی تھی اور توانا تھی۔ مگر اب ایک عمر کے تمام ہونے تک اسے بھٹکنا ہوگا۔"

یہ اقتباس ہی کہانی کا مرکز اور کہانی کی جان ہے۔ اسے افسانے کے متن سے جدا کرتے ہی تمام دانے بکھر جانے کا قوی خدشہ ہے۔ گو کہ پہلے افسانے سمیت کچھ اور افسانوں میں مصنفہ کے سیاسی رجحانات کی جھلک ملتی ہے لیکن انھیں مصنفہ نے ہر ممکن حد تک تعصب کی آمیزش سے پاک رکھا ہے اور مقفیانہ انداز میں کوئی حکم لگانے کی کوشش نہیں کی ورنہ افسانوں کا اسلوب اور حسن مجروح ہونے کا شدید احتمال ہوتا۔

"سحر سے ذرا پہلے" کا موضوع اہم ہونے کے ساتھ ساتھ کافی نازک و حساس بھی ہے۔ جابرانہ نظام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والوں کے ساتھ مقتدرہ کا سلوک اور اس سے جڑے شاخسانے۔ اس موضوع کے پیچیدہ تر پہلوؤں کی طرف مصنفہ نے شاید قصداً دھیان نہیں دیا یا اس کی غیر پیچیدہ جہات ہی نے زویا کے خلاق ذہن اور حساس دل کو اس تیزی اور سختی سے گرفت میں لیا کہ اس کے قلم سے گویا کسی خودکار میکانیکی انداز میں ایسے جملے نکلتے چلے گئے:

"حسام! یہ سب باتیں جو تم کر رہے ہو نا، ہر دوسرے دن کئی برسوں سے کوئی نہ کوئی دہراتا آیا ہے۔ ہر دوسرے دن کوئی انتظار کرتا وجو ہمت ہار دیتا ہے تو ایسے ہی الفاظ دہرائے جاتے ہیں، پھر بھی لوگ مر جاتے ہیں۔" اسی نوع سے ملتا جلتا ایک اور اہم موضوع انسانی سمگلنگ ہے جو تیسری دنیا کے ممالک کا مشترکہ المیاتی سماجی ورثہ ہے اور جسے زویا نے اپنے خوب صورت افسانے "آپنک رومانس" میں مشاقی سے برتا ہے۔ سبز باغ جیسے فرسودہ ہوتے محاوراتی انداز کی جگہ گلابی سپنوں کی اصطلاح بہت منصفانہ طریق سے برتی گئی ہے کیونکہ افسانے کے موضوع کے عین مطابق گلابی رنگ ذرا سا گہرا ہو کر خون سا سرخ ہوتا چلا جاتا ہے۔ سو جہاں ایک طرف جبر کے خلاف آواز اٹھانے والے

گمشدہ ہو جاتے ہیں، وہیں ایسے انسان بھی ملتے ہیں جو اپنے گلابی خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے خود کو غلط ہاتھوں میں دے کر زندگی نہ صرف داؤ پر لگا دیتے ہیں بلکہ اکثر ہار بھی جاتے ہیں۔ ''آپنک رومانس'' میں ایسے ہی ایک دیہاتی نوجوان ریحان کی ناکام جدوجہد کی داستان بیان ہوئی ہے جو ایک موچی کا بیٹا ہونے کی قیمت ملک میں رہ کر چکانے پر راضی بھی نہیں اور اسی سماج میں رہتے ہوئے اس کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں۔ سو مجبوراً وہ انسانی سمگلروں کے توسط سے سمندر پار قسمت آزمائی کا ارادہ کرتا ہے۔ پھر جیسا کہ اکثر قسمت عجیب کھیل کھیل جاتی ہے، یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے: ''ریحان جانتا تھا کہ اب وہ جو گلابی آسماں ڈھونڈنے نکلا ہے تو کئی سیاہ آسماں اسے عبور کرنے تھے--- کون جانتا تھا وہ کس خواب میں مرا مگر---'' اس افسانے میں راست انداز واضح ہونے کے باوجود جا بجا استعاراتی پیوندکاری نے پلاٹ پر ایک متنوع نمونہ کاری / mosaic pattern کا منظر اجاگر کیا ہے جو افسانے کے معیار کو رفعت عطا کرتا ہے۔ اسی طرح ''کہانی کے اس پار'' میں ایک حجام کے بیٹے کے ارمانوں اور خوابوں کو حقیقی زندگی کے مقتل میں ذبح ہوتے دکھایا گیا ہے۔ معاشی زینے کی سیڑھیاں چڑھنا ایک استحصالی معاشرے میں کتنا مشکل کام ہے، اس کا بخوبی اندازہ ان دو افسانوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ بس واحد فرق یہ ہے کہ ''کہانی کے اس پار'' کے مرکزی کردار کو ریحان کے برعکس وطن کے اندر ہی گاؤں سے شہر کی طرف ہجرت کے بعد مایوسیوں کے سمندر میں ڈوبنا پڑتا ہے۔

عورت کے نفسیاتی مسائل، خاص طور پر جنھیں کسی حد تک اب بھی ''موضوع ممنوعہ / Taboos'' گردانا جاتا ہے، اس پر ایک خاتون افسانہ نگار کا قلم اٹھانا جہاں کچھ احباب کو قابلِ اعتراض و مذمت لگ سکتا ہے، وہیں یہ ادب کے سنجیدہ قاری کے لیے خوشگوار حیرت کا سامان بہم کرتا ہے۔ ''کھڑکی میں اگا وجود'' عورت کی جنسی ناآسودگی اور گھریلو تشدد کے بدذائقہ اجزا سے بنا معجون ہے جس میں ورائے متن بہت سوں کو کچھ گرد آلود سا آئینہ دکھائی نظر آنے کا خدشہ ہے۔ خود کلامی اور اپنے ماحول کو سراب کی عینک سے دیکھنے کے نامانوس آمیزے نے ''یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی'' کا عملی نظارہ کرا دیا جس کی لیے مصنفہ بہت زیادہ داد کی مستحق ہے۔

زویا حسن کے افسانوی کرافٹ میں یہ طے کرنا محال ہے کہ واحد متکلم کی صورت ان کا کوئی کردار لفظوں سے گفتگو کرتا ہے یا الفاظ مصنفہ کے لاشعور میں پلٹ کر اس سے مخاطب ہوتے ہیں یا یہ الفاظ کی آپسی بات چیت ہے۔ یہ معمہ نما صورتحال کم و بیش سبھی افسانوں میں کہیں جابجا اور کہیں صرف منتخب مقامات پر دکھائی دیتی ہے اور یہیں سے مصنفہ کی کامیابی کا سفر شروع ہوتا ہے کیونکہ ایسے "دو چار سخت مقام" ہی قاری کی نگاہ و فکر کو اپنی جکڑ میں لیے رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ بادی النظر میں ایسے اقتباسات پر فلسفیانہ طرزِ تحریر کا گماں گزرتا ہے لیکن دراصل ایسا اندازِ بیان بین السطور جہانِ معنی دریافت کرنے کے ساتھ کثیر ابعاتی تجزیے اور متن کشائی کے در کشادہ کرتا ہے۔ ذرا اس مختصر اقتباس کا مطالعہ کیجیے اور پھر خود فیصلہ کیجیے کہ اس کی تاثیر محض مقامی ہے یا آفاقی: "وہ اس دیس کا باسی نہیں تھا اور تمھیں پتا ہے یہ سب سر پھرے اس دیس کے باسی نہیں ہوتے۔" پھر اسی افسانے میں کچھ آگے چل کر صورتحال ملاحظہ کیجیے: "یہ لوگ اس گیلی لکڑی کی طرح ہیں راھب جو سلگتی تو ہے، جل نہیں سکتی۔"

زویا کے افسانے میری رائے میں ایسے استعارات کی گنجلک میں الجھے ہیں جنھیں سلجھاتے سلجھاتے کبھی تو معانی کی سیدھی ڈور ہاتھ آجاتی ہے تو کبھی علامتی گرہوں میں قرات کی انگلیاں پھنس جاتی ہیں۔ "من کونج" میں منڈیروں اور کونجوں کے تذکرے سے کچھ ایسی ہی صورت پیدا کی گئی ہے لیکن افسانے کے اختتام پر منیر نیازی کا شعر سیدھی ڈور کی طرح اس کی پیچیدہ گرہیں کھول دیتا ہے:

واپس نہ جا وہاں کہ ترے شہر میں منیر
جو جس جگہ پہ تھا وہ وہاں پر نہیں رہا

....

یہ کہا جا سکتا ہے کہ زویا حسن کے کردار اور الفاظ بہت ہی منفرد طریقے سے یوں گتھم گتھا ہوتے ہیں کہ کئی مقامات پر یہ گمان ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے گویا قاری کو آزادی دے رکھی ہے کہ چاہے تو کردار کو لفظ سمجھے اور چاہے تو لفظ کی تجسیم تو کرتے ہوئے اسے ہی کردار سمجھ لے۔ یہی عنصر جدید فکشن نگاری کے خدوخال تشکیل دینے کا استحقاق رکھتا ہے۔ لفظوں اور کرداروں کی اس دھینگا مشتی میں کبھی تا شجیا امپائر کا کردار ادا کرتا ہے تو کبھی زمان و مکان کی گرفت سے آزادی کی سعی ناکام ایک عمل انگیز کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ یوں زویا حسن کے افسانوں میں ڈرامائیت

ایک انوکھے روپ میں کسی چور دروازے سے داخل بھی ہوتی ہے اور جانے کس وقت چپکے سے کسی اور درز سے نکل بھی جاتی ہے۔ زمان و مکان کے گورکھ دھندے کا شاخسانہ مجھے ''خدا کے نام بے نام خط'' میں سب سے زیادہ متاثر کن لگا۔ ناانصافی کے نظام کی سلاخوں سے بنائے گئی کال کوٹھری میں ٹھہرائے جانے والے مہمانوں کی نفسیات جیسے یہاں پیش کی گئی ہے ویسی دوستوفسکی کے شہکار ناول '' جرم و سزا / Punishment and Crime '' میں بھی نہیں ملتی کیونکہ دوستوفسکی کا زمانہ، ماحول، مرکزی کردار کی حیثیت اور سماجی جال کچھ اور نوعیت کے تھے۔

زمانی گرفت سے آزادی کی آرزو کا تذکرہ میں گزشتہ سطور میں اشارتاً کر چکا۔ اس کی صورت گری ایک اور کردار کی زبانی ملاحظہ کیجیے اور لطف کشید کیجیے: '' تم جان لو، ایک بات سمجھ لو کہ میں اس وقت سے پرے اور زمانے سے آگے تمھیں دیکھتا ہوں۔ تمھاری عمر میرے لیے ایک رومانس ہے۔ تمھارے ہاتھوں اور چہروں کی لکیریں میرا صبر ہیں جو میں نے تمھیں پانے کے لیے کیا ہے۔ بس تم اپنے اور میرے بیچ کسی فاصلے کا ذکر مت کرنا۔'' ایسے مکالمے روحانی / افلاطونی عشق کا مفہوم قاری کو سمجھاتے ہیں اور قاری بھی اپنی بصیرت و بصارت کو ملا کر ورائے وقت مناظر دیکھنے کی جستجو میں لگ جاتا ہے۔

آخر میں ایک مشاہدے کا ذکر ضروری ہے: کئی افسانوں میں لفظ '' بھیتر'' برتا گیا ہے جبکہ اس کے اردو/ فارسی متبادل سے بخوبی کام چلایا جا سکتا تھا۔ گو کہیں بھی یہ لفظ نہ تو کھلتا ہے اور نہ بوجھل فضا پیدا کرتا ہے کیونکہ کچھ اور ہندی الفاظ بھی بڑے سلیقے سے استعمال ہوئے ہیں جیسے چندر مکھی کو تلمیحی انداز میں ایک افسانے میں بڑی نفاست سے مکالمے کا حصہ بنایا گیا ہے۔

بس اس لفظ نے میرے لیے تجسس کا ایک دھندلا سا ماحول بنا دیا ہے اور کچھ بعید نہیں کہ یہ دھند چھٹنے پر مجھے تخلیقی ذہن کی نفسیات سمجھنے میں کچھ اور مدد مل جائے۔

احباب! بلاشبہ زویا حسن کا پہلا مجموعہ ہر معیاری لائبریری کی زینت بننے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ زویا اور اکادمی بازیافت دونوں مبارک کے مستحق ہیں کہ ایک شاندار افسانوی مجموعے سے ہمارا تعارف کرایا گیا۔

زویا کے قلمی سفر کے لیے بہت دعائیں اور قوی توقعات۔

☆☆☆☆☆

مظفر وارثی / آسمانِ نعت کا درخشندہ ستارہ

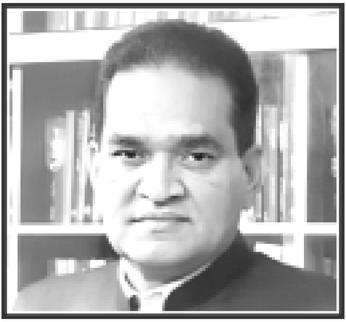

علی رضا

تخلیقِ نعت کے حوالے سے بامِ عروج پر پہنچنے والے عہد ساز شاعر مظفر وارثی کا نام آسمانِ سخن پر ہمیشہ جگمگاتا رہے گا- وہ 23 دسمبر 1933 کو میرٹھ میں پیدا ہوئے- اُنھوں نے ساٹھ کی دہائی میں لکھنا شروع کیا اور اپنے شاندار تخلیقی کام کی وجہ سے نمایاں مقام پر فائز ہوئے---

مظفر وارثی اُن خوش قسمت شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جن کی فکری پرواز بہت بلند تھی--- اُنھوں نے حمد و نعت لکھی تو زباں زدِ خاص و عام ہوئی--- نظم و غزل کہی تو علمی، ادبی اور تخلیقی حلقوں سے اُسے بھی بھرپور انداز میں پذیرائی حاصل ہوئی اور اسے تحسین کی نظر سے دیکھا گیا--- اُنھوں نے فلمی گیت بھی لکھے جنھیں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی لیکن مذہب اور دین کی طرف رجحان اور تصوف سے روحانی وابستگی کی وجہ سے وہ اس سلسلہ کو زیادہ دیر آگے نہ بڑھا سکے اور آخر کار حمد و نعت کا سائبان عطا اُن کا مستقر بن گیا--- مظفر وارثی نے بہت کچھ لکھا اور اُن کی غزل کے 22 مجموعوں کے علاوہ ایک خودنوشت بھی منصۂ شہود پر آئی- اُن کے حمد و نعت پر مشتمل مجموعہ ہائے کلام ''لاشریک'' (حمدیہ)، ''وہی خدا ہے'' (حمدیہ)، ''تاجدارِ حرم'' (نعتیہ)، ''کعبۂ عشق'' (نعتیہ)، ''نورِ ازل'' (نعتیہ)، ''بابِ حرم'' (نعتیہ)، ''میرے اچھے رسول'' (نعتیہ)، ''صاحب التاج'' (نعتیہ)، ''اُمی لقبی'' (نعتیہ) سمیت کئی دوسرے دیوان شائع ہو چکے ہیں--- علاوہ ازیں وہ ایک قومی اخبار میں حالات حاضرہ سے متعلق قطعات بھی باقاعدگی سے لکھتے رہے تاہم اُن کی تخلیقی شناخت کا نمایاں حوالہ اُن کی نعت

گوئی ہی بنا--- اُن کی نعت کا جہانِ معنی سیرت نبوی کے تذکار اور محبت وعقیدت رسالت مآب کی روشنیوں سے منور ہے یہی وجہ ہے کہ بارگاہ رسالتؐ مآب میں پیش کیے گئے اُن کے سخن ہائے دلنواز مقبولیت کے درجہ کمال تک پہنچے--- خداوندِ متعال کے دربار میں عقیدت کے اظہار کا یہ والہانہ پن دیکھیں-----

کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے وہی خدا ہے
دکھائی بھی جو نہ دے، نظر بھی جو آ رہا ہے وہی خدا ہے
تلاش اُس کو نہ کر بتوں میں، وہ ہے بدلتی ہوئی رُتوں میں
جو دن کو رات اور رات کو دن بنا رہا ہے، وہی خدا ہے

....

آنکھ اٹھے تیرے لیے کھلتے ہیں لب تیرے لیے
میرا جینا میرا مرنا میرے رب تیرے لیے
روشنی ہو یا اندھیرا تجھ سے میں غافل نہیں
میرا دن تیرے لیے ہے میری شب تیرے لیے

....

مظفر وارثی کا نعتیہ کلام طویل مدت گزرنے کے باوجود اپنی اثر آفرینیوں اور فنی حسن کاریوں کی وجہ سے آج بھی اپنی تروتازگی برقرار رکھے ہوئے ہے یہی وجہ ہے سننے والے پر سماعت کے دوران روحانیت کی کئی کیفیات آشکار ہوتی ہیں مثال کے طور پہ نعتیں دیکھیں:

تو کجا من کجا، تو کجا من کجا
تو امیرِ حرم، میں فقیرِ عجم
تیرے گُن اور یہ لب، میں طلب ہی طلب
تو عطا ہی عطا، میں خطا ہی خطا
تو کجا من کجا، تو کجا من کجا

....

مفلس زندگی اب نہ سمجھے کوئی مجھ کو عشق نبی اس قدر مل گیا
جگمگائے نہ کیوں میرا عکسِ دروں ایک پتھر کو آئینہ گر مل گیا
ذہن بے رنگ تھا سانس بے ربط تھی کار زارِ معصیت کی کڑی دھوپ تھی
اُس کی چشم کرم رونق جاں بنی چھاؤں جس کی گھنی وہ شجر مل گیا

....

مرا پیمبر عظیم تر ہے
مرا پیمبر عظیم تر ہے
کمالِ خلاق ذات اُس کی
جمالِ ہستی حیات اُس کی
بشر نہیں عظمتِ بشر ہے

....

تو مدینے کی زمیں پر مرا مدفن لکھ دے
میں دعا دوں گا کہ بستا رہے مکہ تیرا

....

اُن کی نعتیں روانی، سلاست اور عمدگی کی جملہ خصوصیات اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں اس تناظر میں کچھ مزید اشعار دیکھیے:

جو تیری ثنا میں نہ ہو فنا مجھے وہ زباں نہیں چاہیے
ترے پیار میں ہیں مری زمیں مجھے یہ جہاں نہیں چاہیے
یہ ترا مظفرِ خوش نوا اسے جانتے ہیں شہ و گدا
ترے سنگِ در پہ مرے اگر تو کوئی نشاں نہیں چاہیے

....

اپنی رحمت کے سمندر میں اُتر جانے دے
بے ٹھکانہ ہوں ازل سے مجھے گھر جانے دے
خواہشِ ذات بڑا ساتھ دیا ہے تیرا
اب جدھر میرے محمدؐ ہیں اُدھر جانے دے

مظفر وارثی جہاں بڑے شاعر تھے وہاں انہیں قدرت نے دل نشین لحن سے بھی نواز رکھا تھا وہ جب مشاعروں میں خوش گلوئی سے اپنا کلام سناتے تو سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ---- مظفر وارثی کی شرکت مشاعروں اور ادبی تقریبات میں کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی --قدرت نے اُن کے گلے کو ایسے سوز سے نوازا تھا جس میں رچاؤ بھی تھا اور جذبوں کا بہاؤ بھی ---

انھوں نے نئے لکھنے والوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی فرمائی اور اُنھیں اچھے اشعار پہ داد دینے میں کبھی بخل سے کام نہ لیا-----

وہ ادب میں مقصدیت کے قائل تھے اور اُن کے موضوعات زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان اور انسانوں سے جڑے ہوئے تھے-- وہ ایک باعمل اور صاحبِ کردار شخصیت کے مالک تھے بینک دولت پاکستان میں طویل عرصہ تک اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں نہایت دیانت داری اور فرض شناسی سے ادا کرنے کے بعد سرکاری ملازمت سے عزت اور وقار کے ساتھ سبکدوش ہوئے----

1988 میں آپ کو حکومت پاکستان کی جانب سے صدارتی تمغۂ حسنِ کارکردگی بھی پیش کیا گیا علاوہ ازیں لاتعداد ملکی اور غیر ملکی ایوارڈز بھی اُپ کی شہرت، نیک نامی اور عزت و تکریم میں اضافے کا باعث بنے -------

مظفر وارثی زندگی کے آخری عرصہ میں رعشہ سمیت کئی عوارض میں مبتلا رہنے کے بعد 28 جنوری 2011 بروز جمعہ 77 برس کی عمر میں اس دارِ فانی سے اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے--- نمازِ جنازہ اُن کی وصیت کے مطابق مولانا احمد علی قصوری سے پڑھوائی گئی اُن کی آخری آرام گاہ جوہر ٹاؤن لاہور کے سمسانی قبرستان میں ہے---

آخر میں اُن کی ایک مکمل نعت نذرِ قارئین ہے-----

قلم سے لوح سے بھی قبل دن سے رات سے پہلے
نبی کا نور تھا موجود، موجودات سے پہلے

تلاوت دیدۂ آدم نے کی اسمِ محمد کی
ستونِ عرش پر کندہ تھا التحیات سے پہلے

وہی تھے صرف جو تلوار لے کر غار سے نکلے
پیمبر، یوں نہ صف آرا ہوئے، غزوات سے پہلے

کھلا کرتی ہیں نامعلوم سے معلوم کی راہیں
خدا کی نفی کرتی ہے زباں، اثبات سے پہلے

اُنھی کا ہر عمل ہر بات، بہبودِ بشر ٹھہری
نہ تھا منشور ایسا خطبۂ عرفات سے پہلے

میں اپنی سمت بھی اب، اُس طرف سے ہو کر آتا ہوں
محمد کی گلی پڑتی ہے کوئے ذات سے پہلے

مظفر بیٹیوں کو باپ زندہ گاڑ دیتے تھے
بہت جاہل تھی دنیا اُن کی تعلیمات سے پہلے

☆☆☆☆☆

پروفیسر غازی علم الدین

ہارون الرشید

غازی علم الدین شہید ایک مشہور اور امر نام ہے۔ ناموسِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان ہونے والے نوجوان غازی علم الدین کا تعلق لاہور سے تھا۔ تقریباً ایک صدی قبل دائمی شہرت پانے والے غازی علم الدین کا نام اتنا مقبول ہوا کہ وطن عزیز میں بے شمار والدین نے اپنے نوزائیدہ بچوں کا نام ان کے نام پر رکھا۔ پروفیسر غازی علم الدین کے والدین نے بھی شاید انھی سے متاثر ہو کر اپنے بیٹے کا نام غازی علم الدین رکھا۔ انھوں نے علم وادب کا راستہ اختیار کیا اور اس میں نام پیدا کیا۔

غازی علم الدین یکم جنوری 1959 کو پنجاب کے مشہور شہر قصور کی ایک تحصیل برج کلاں میں پیدا ہوئے۔ برج کلاں بی آر بی کے کنارے اور دریائے ستلج کے قریب ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم یہیں سے حاصل کی۔ پھر ڈگری کالج قصور اور اورینٹل کالج لاہور میں بھی زیر تعلیم رہے۔ یہیں سے عربی اعلوم اسلامیہ میں ایم اے کیا۔ بعد میں دوران ملازمت علوم اسلامیہ میں ایم فل کی ڈگری بھی حاصل کی۔ 1984 میں انٹرمیڈیٹ کالج فورٹ عباس ضلع بہاول نگر سے بطور لیکچرر پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔

ایک سال بعد کوٹلی (آزاد کشمیر) کے ڈگری کالج چلے آئے۔ یہاں تین سال تک طلبا کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔ پھر گورنمنٹ ڈگری کالج میرپور آ گئے، یہاں ایک عشرے تک رہے۔ ڈگری کالج ڈڈیال (آزاد کشمیر) میں بھی رہے۔ گورنمنٹ کالج گل پور (آزاد کشمیر) اور گورنمنٹ ڈگری کالج افضل پور (آزاد کشمیر) میں پرنسپل کے فرائض بھی سرانجام دیے۔ طویل عرصے تک آزاد کشمیر اور میرپور میں رہے۔ آخر یہیں کے ہو رہے۔

پروفیسر غازی علم الدین نہایت باصلاحیت اور ذی خرد استاد ہونے کے علاوہ اعلیٰ پائے کے ادیب بھی تھے۔ لسانیات ان کا محبوب موضوع تھا۔ "میثاق عمرانی"، "لسانی مطالعے" اور "تنقیدی و تجزیتی زاویے" ان کی اہم تصانیف ہیں۔ ہندوستان میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ان کی تصانیف، لسانی لغت، "اردو معیار اور استعمال" اور سرمایہ "مفاہیم" کے غازی علم الدین فکر و فن نمبر پر جو کام کیا ہے وہ نہایت اہم ہے۔ غازی علم الدین کے تحریر کردہ بے شمار مضامین بھارت، ترکی، کینیڈا اور پاکستان کے کئی علمی و ادبی جریدوں، مجلوں اور اخبارات کی

زینت بن چکے ہیں۔

ان سے میرا تعلق آج سے کوئی پندرہ سال پہلے اس وقت قائم ہوا جب وہ میرپور (آزاد کشمیر) کے ڈگری کالج سے بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر وابستہ تھے۔ میں بھی ان دنوں کیڈٹ کالج بڑاہی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر تھا۔ انھوں نے اپنے کالج کا سالانہ ''سروش'' وہ اپنے خوبصورت اور مفصل خط کے ارسال کیا اور اس کے متعلق تاثرات لکھ کر ارسال کرنے کی بھی استدعا کی۔

''سروش'' کا یہ شمارہ کسی کالج کا مجلہ کم اور ادبی شاہکار زیادہ لگتا تھا۔ ''سروش'' کا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے اس پر ایک تفصیلی تبصرہ لکھ کر انھیں ارسال کیا، جسے انھوں نے اس کے اگلے شمارے میں شائع کیا۔ ''سروش'' جب بھی شائع ہوتا، وہ پہلی فرصت میں مجھے ارسال کرتے تھے۔ اس مجلے میں کالج کے طلبا کے علاوہ بعض نامور اہلِ قلم کی منتخب تحریریں بھی دیکھنے میں آتی تھیں، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وطنِ عزیز کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں سے ان کے کتنے اچھے مراسم ہیں۔

بعد میں انھوں نے اپنی کتابیں ''لسانی مطالعے'' اور ''تنقیدی و تجزیاتی مطالعے'' مجھے ارسال کیں۔ غازی علم الدین سنجیدہ اور متین شخصیت کے مالک تھے۔ وسیع المطالعہ تھے۔ اردو زبان پر بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ صرف و نحو پر بڑے ٹھوس اور مدلل دلائل رکھتے تھے۔ اخبارات اور رسائل میں شائع ہونے والے مضامین میں اردو زبان کی فروگذاشتوں پر نگاہ رکھتے تھے اور ان کے متعلق مضامین لکھتے تھے۔ ''الفاظ کا تحقیقی اور معنوی و اصطلاحی پس منظر'' اور ''اردو کا ملی تشخص اور کردار'' ان کے اہم مضامین ہیں، جو ان کی کتابوں کے علاوہ ''سروش'' کے دو ہزار گیارہ اور بارہ کے شماروں میں بھی محفوظ ہیں۔

غازی علم الدین سے زیادہ رابطہ فون پر رہتا تھا۔ چند برس قبل میرپور کے بزرگ مہربان اور شاعر زید اللہ فہیم اور کراچی کے معراج جامی کے ہمراہ ملنے بڑاہی آئے، رات میرے ہاں ٹھہرے، ان سے گھنٹوں باتیں ہوئیں۔ زید اللہ فہیم بھی پچھلے سال جنوری کے پہلے ہفتے میں داغ مفارقت دے گئے۔ ان کی وفات کی اطلاع بھی انھوں نے ہی دی۔ ان کی یاد میں ہونے والی تعزیتی تقریب میں وہ بھی شامل ہوئے اور ان کی شخصیت اور فن پر گفتگو کی اور فون کرکے مطلع کیا۔ غازی علم الدین اپنے کالج کے مجلے میں ہزارہ کی بزرگ ادبی شخصیات کے کلام اور ان کی تحریروں کو بھی جگہ دیتے تھے۔ آصف ثاقب، سلطان سکون اور ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان کی تحریریں ''سروش'' کے تقریباً ہر شمارے میں دیکھنے میں آتی تھیں۔ ان سے رابطے میں بعض اوقات مہینوں کا وقفہ آجاتا تھا، شاید اس کی وجہ میری کوتاہی بھی تھی۔

گئی سردیوں میں انھیں فون کیا تو وہ الشفا ہسپتال اسلام آباد سے گھر کو روانہ ہو رہے تھے۔ میں نے حال پوچھا تو کہنے لگے۔ ''سرطان کا شکار ہوگیا ہوں، یہاں میرا علاج ہو رہا ہے۔ بار بار

آنا پڑتا ہے۔ شفایابی کے لیے دعا کریں۔'' ان کی باتیں سن کر میں لرز کے رہ گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ غازی علم الدین اتنے زیادہ علیل ہیں، اور نہایت مہلک مرض کی زد میں آچکے ہیں۔ وہ پُرامید تھے کہ صحت مند ہو جائیں گے۔ اس کے بعد میں نے متعدد بار فون کر کے ان کی خیریت معلوم کی۔ بار بار شکریہ ادا کرتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے'' آپ کو چند کتابیں پوسٹ کرنا چاہتا ہوں، پتہ نوٹ کروائیں، میں نے کہا'' آپ تندرست ہو جائیں، پھر کتابیں بھی آجائیں گی۔ فی الحال اپنا خیال رکھیں۔'' جنوری اور فروری میں انھیں فون نہیں کر سکا، مجھے تشویش لاحق تھی جانے وہ کس حال میں ہوں گے۔ رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ عید کے دن قریب تھے۔ انھیں فون کیا تو کسی نے جواب نہیں دیا۔ اندازہ تھا کہ وہ تکلیف میں ہوں گے۔ سوچتا رہا انھیں فون کروں کہ نہ کروں کہ 10 اپریل کے ''جنگ'' راولپنڈی میں شائع ہونے والے ممتاز ادیب، شعر اور صحافی محمود شام کا کالم پڑھنا شروع کیا تو اس کی ابتدائی سطور نے ہی بے حال کر دیا، آنکھیں بھر آئیں، انھوں نے لکھا تھا۔

''ہمارے مہربان اور اُردو زبان کے عاشق، انتہائی اہم تحقیقی دستاویز تخلیق کرنے والے، میر پور آزاد کشمیر میں خوشی سے تحقیق و تالیف میں مصروف، پروفیسر غازی علم الدین ماہنامہ امراض سمیت اکثر علمی جرائد کے پُرمغز مضامین سے مالا مال کرنے والے سرطان کا مقابلہ کرتے ہوئے 7 اپریل کو اس دنیا سے اُٹھ گئے۔ مشکلات کا سامنا کرتی قومی زبان ہوتے ہوئے سرکاری اختیار سے محروم اُردو زبان کے لیے ان کی تحریریں بہت ہی منفرد اور وقت کے تقاضے پورے کرتے تھیں۔ (مرحوم) تمام اہم درس گاہوں کی لائبریریوں کو، ادبی جرائد کے یہ قیمتی خزانے تحفے کے طور پر ارسال کرتے۔ لسانی مطالعے تخلیقی زاویے، اردو کا مقدمہ، میزان انتقاد و فکر ان کی گراں قدر تصانیف ہیں۔ اُردو املا، اُردو نام اُردو تراکیب اور اصطلاحات پر اُن کی تحریریں اُن کی اُردو سے لگن کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔''

محمود شام کا کالم پڑھنے کے بعد میں نے ان کے سیل نمبر پر رابطہ کیا۔ ان کے بیٹے اور بیٹی سے باتیں ہوئیں، میں نے تعزیت کی۔ کہنے لگے وہ پچھلے کئی دنوں سے بہت نقاہت کا شکار تھے۔ بات کرنے کے قابل نہیں تھے۔ اس دوران سو سے زیادہ کالیں اور میسج آئے۔'' غازی علم الدین کی بے چین روح کو آخر قرار آگیا۔ اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن ان کی خوب صورت شخصیت، مہربان سراپا اور اُن کا تخلیقی ورثہ ہمیشہ ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ میر تقی میر نے شاید انہی کے بارے میں کہا تھا:

عالم میں لوگ ملنے کے گوں اب نہیں رہے
ہر چند ایسا ویسا تو عالم بہت ہے یہاں

☆☆☆☆☆

اجالے اپنی یادوں کے ـــ ایک تاثر

یادنگاری ایک بہت دلچسپ سلسلہ ہے گزرے ہوئے وقت نے دل و دماغ پر جو نقوش ثبت کیے ہوتے ہیں انھیں قلم بند کر کے دوسروں سے شیئر کرنا گونہ تسکین کا سبب بنتا ہے۔ پھر یادیں اگر تعمیری ہوں اور انسانیت کی فلاح و بہبود سے متعلق ہوں تو یقیناً آئندہ نسلوں کے لیے تربیت کا پہلو بھی ان میں موجود ہوتا ہے۔

پروفیسر سید اظہار الحسن بخاری اپنی ذات میں ایک ادارہ ہیں۔ جون 2008 سے دسمبر 2012 تک مجھے براہ راست ان سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔ تقریباً 5 سال مسلسل ان کی مہربان اور انسان دوست شخصیت کے جملہ پہلوؤں کی رونمائی ہوتی رہی ہے جب کہ ان کی کتاب کی رونمائی ہوئی تو تمام مناظر آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔

H-9 کالج ان کی شخصیت سازی سے لے کر ان کی فیض رسانی کے بیسیوں مراحل و مواقع کا گواہ ہے اس لیے اس کتاب میں زیادہ حصہ اُسی کا ہے تاہم وہ اپنے والدین، اساتذہ، رفقائے کار کو صفحہ صفحہ، نہایت نظر افروز رنگوں سے مصور کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ میں تو اس کتاب کو مرقع نگاری کا نام دوں گا، جس میں گزشتہ پچاس سالوں کی ایسی تصویریں ہیں جنھیں دیکھ کر ہمیں ملک، حکومتوں، اداروں، شخصیات کے اخلاق و اطوار کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً ایک تصویر دیکھیں:

"چند ہی لمحات میں وزیر موصوف نے ہمیں بلا لیا۔ اپنی نشست سے کھڑے ہو کر ملے۔ چائے پیش کی اور ہمارا مطالبہ غور سے سنا اور عملدرآمد کی یقین دہانی کرائی۔"

افسوس ہمارا حال ماضی کی اس تصویر کو خیالی کہنے پر بضد ہے لیکن یہ وہ سچ ہے جس کو بخاری صاحب کے قلم نے زندہ کر دیا ہے۔ ایک بات، جس کی طرف احسان اکبر صاحب نے اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ دیکھنے والی آنکھ اگر مخلص ہو اور مثبت زاویے سے اطراف و جوانب کا جائزہ لینے کی عادی ہو تو منفی باتیں کم ہی بار پاتی ہیں میں سمجھتا ہوں بخاری صاحب خود اتنے مہذب، مخلص، مہربان اور سراپا توفیق ہیں کہ انھوں نے احباب و رفقا کی شخصی کمزوریوں کو دیکھا ہی نہیں اگر دیکھا بھی ہے تو

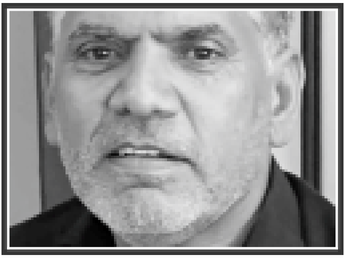

شہاب صفدر

کم از کم۔ دکھانے سے پرہیز کیا ہے ان کے درج ذیل بیان کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں۔

''میں نے ہر دور میں خلوص، محنت اور دیانتداری سے تدریسی فرائض کے ساتھ ساتھ انتظامی امور میں پرنسپل صاحبان کا ہاتھ بٹایا''

بخاری صاحب کی خودنوشت میں بعض ایسے واقعات بیان ہوتے ہیں کہ حیرت سے آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں۔ مثلاً اوجڑی کیمپ واقعے کی تفصیل یا کالج طلبہ اور F-27 طیارے کی گمشدگی وغیرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں کسی واقعے کی جزئیات تک محفوظ ہیں اور برسوں بعد بھی انھوں نے ان کو دہراتے میں کسی قسم کی چوک کا مظاہرہ نہیں کیا۔

اس کتاب میں ان کی مذہبی فکر اور حج وغیرہ کے سفر کی کہانی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اسلام اور اس کے احکام کو انھوں نے کسی منزل پر پسِ پشت نہیں ڈالا ایک تو وہ سند ہیں اور گھریلو تربیت کا اثر ہے دوسرا ان کے معتدل اور صلح کل نے بھی انھیں ایک خاص دائرے میں لکھا۔

اس کتاب میں بخاری صاحب نے فلاح و بہبود کے جن کاموں اور کوششوں کا ذکر کیا ہے وہ تحدیثِ نعمت ہے۔ انھوں نے واقعی زلزلے، سیلاب اور دیگر مشکلات میں عملی طور پر جدوجہد کی ہے شعر و ادب سے وابستہ لوگ عموماً عملی زندگی میں کمزور ہوتے ہیں لیکن بخاری صاحب کے ان سانحات کے عینی شاہدین ابھی تک موجود ہیں۔ پروفیسرز کے لیے ان کی جنگ و دو کا تو میں خود گواہ ہوں اُن کے ساتھ جا کر ڈی چوک میں احتجاج کرنے والوں میں شامل رہا ہوں۔

کتاب کا آخری حصہ (مرحوم) شخصیات کے لیے وقف ہے۔ انھوں نے گزرے ہوئے احباب کے کمال خاکے کھینچے ہیں۔ H-9 کالج میں اُن کے اور میرے رفیق حسن عظیم ورک جو کرونا کا شکار ہوئے دیکھیں ان کی کیسی عکاسی کی ہے:

''غالباً سال 2000 کا ذکر ہے میں نے اپنی پہلی کلاس سے فارغ ہو کر شعبہ اردو میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک نوجوان نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے نہایت خلوص سے سلام کیا میں نے اُس کے سراپا پر نظر ڈالی تو ایک پُرکشش شخصیت دکھائی دی۔ درمیانہ قد سانولی رنگت، بادامی آنکھیں، ستواں ناک، چہرے پر متانت، عمدہ ہیئر سٹائل، نہایت عمدہ براؤن سوٹ، سرخ نکٹائی جو ہلکے گلابی رنگ کی قمیض پر نہایت نفیس لگ رہی تھی اور پاؤں میں انگریزی بوٹ''

بخاری صاحب کے قلم میں جادو ہے مجھے لگتا ہے خاکہ نگاری میں ان کے ہاں اور زیادہ کشش پیدا ہو جاتی ہے اس لیے اگر وہ منتخب شخصیت کے مفصل خاکے تحریر کریں تو اردو ادب میں اُن کا یہ کنٹری بیوشن یادگار رہو گا۔

''اجالے اپنی یادوں کے'' روشنی اور چمک دمک میں لاجواب ہیں۔ قلم کی روشنائی نے انھیں محفوظ کر کے قارئین کے لیے بھی حظ و استفادہ کا خوب اہتمام کیا ہے۔

اتنی خوبصورت اور بہترین کتاب پر بخاری صاحب اور ان کے چاہنے والوں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

شاہد اشرف......رنگ خوابیدہ پڑے ہیں (نظمیں)

ادب ذاتی خیالات اور محسوسات کا ایسا اظہار ہے جو اس رنگ و بو کا مرقع دنیا کے بارے میں تخلیق کار کا اپنا نقطہ نظر ہے۔ جو اس کی سوچ کا عکس ہے۔ جو اس کے اپنے اور اپنوں کے سانجھے ہیں۔ خوشیاں ہیں۔ ہجر و فراق کی کہانی ہے۔ محبت کے زخموں کی رفوگری ہے۔ معاشرے کی طرز ہے۔ جسے اگلی نسلوں تک تخلیق کار کے عہد کی نمائندگی اور منتقلی کرنی ہے۔

غزلیں، نظمیں دامن کو پھیلائے وسعتِ قلبی سے نوعِ انسان کے سارے درد سمیٹ لیتی ہیں۔ سارے موضوعات کبھی عنوان ہمیشہ نئے رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے انسان کی موت سے کسی دوسرے انسان کی زندگی جنم لیتی ہے۔ کائنات اسی مسمار اور تخلیق نو کے تسلسل سے چل رہی ہے۔ نظمیں نمو پا رہی ہیں اور درد سمیٹ رہی ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں اگر انسان کو بات کہنے کا سلیقہ نہ ہوتا، شعور میں اوزان کے پیمانے ترتیب نہ پاتے تو یہ نمائش (دنیا) کچھ روکھی پھیکی سی ہی ہوتی۔ بے رنگ، بے مزہ۔ بات کہنے کے اس سلیقے نے احساس و جذبات کو کیسی آسودگی بخشی ہے۔ کہ سارا جنوں لفظوں کے حوالے کر کے لکھنے والا ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔ یہ لفظ وحشت سے بچاتے ہیں میرا ایک شعر ہے۔

بس جنوں کا کمال ہے ورنہ
مر ہی جاتے کبھی کے وحشت سے

....

اسی جنون کو نظموں نے اپنی آغوش میں پناہ دی ہے۔ آج میرے پاس ڈاکٹر شاہد اشرف کی نظمیں ہیں۔ کتاب ہے "رنگ خوابیدہ پڑے ہیں" نام ہی بہت خوب صورت ہے۔ زندگی کا غماز، مہکتے بہکتے، ہنستے روتے احساسات کا ترجمان، جذبات کا عکاس یہ نام مجھے ڈاکٹر صاحب کی ایک منفرد شخصیت دکھاتا ہے جہاں وہ بہت شائستگی سے، نفاست سے لفظوں کے تال میل میں نظمیں پرو رہے ہیں۔

ساری نظمیں اپنے اردگرد کے ماحول سے کہانیاں لے کر حساس شاعر کے حلقہء دل میں جاگزیں ہو گئیں تو انھوں نے سانچوں میں ڈھال دیں۔ شکلیں بنا ڈالیں۔ سرشار، اداس، محبت سے مغلوب، ہجر سے بوجھل،

ثمینہ سیّد

فطرت کی ثناخوانی میں مصروف، آفات پہ نوحہ گری کرتی کتنی ہی مجسم نظمیں۔
پہلی ہی نظم ان کے منفرد اسلوب کی غماز ہے۔
"کمسن قالین باف دربار رسالت میں"

تھکن سے چور ان ہاتھوں پہ چھالے جمع کرتے ہیں
زہے قسمت یہ پونجی ہاتھ ننھے جمع کرتے ہیں

ہر اک دھاگے پہ پڑھتے ہیں درود ان پر، سلام ان پہ
یہی اجرت ہے جو قالین بُن کے جمع کرتے ہیں

....

ایسے بابرکت آغاز نے ہی دل خوش کر دیا۔ میں نظموں کی حیرتوں میں گم ہو کر داد و تحسین دینے پر مجبور ہوں۔ نظم ایسی پیاری، نرم رو اور مسلسل تخلیق ہے کہ اس میں سے ٹکڑے انتخاب کرنا وہ بھی ایسے جو پوری نظم کی نمائندگی کر سکیں ایک مشکل ترین کام ہے۔
"چشمہ" میں لکھتے ہیں:

اگر ناراض نسلوں کا کوئی ردعمل ہے
تو سبب یہ ہے کہ عصر کربلا سے آج تک دریا پہ پہرے ہیں
ہمارے ہونٹ پانی کو ترستے ہیں
یہ کیسا سانحہ ہے، ہر کوئی حیرت زدہ ہے
جہاں پر بم پھٹا ہے، اب وہاں سے ایک
چشمہ پھوٹ نکلا ہے

....

"ساعت منتظر ہے" میں ایک تو مولود کی آمد اور اس کی آخری ہچکی سے شاید کوئی ذاتی دکھ جڑا ہے۔ "عزیٰ، درگا، سیرس" میں کیسے کیسے تاریخی حوالے اختصار کے باوجود اپنا حسن برقرار رکھے ہوئے ہیں:

یہ دنیا سرمایے کے لٹو پر گھوم رہی ہے
عزیٰ درگا ساکت ہیں سیرس ماتا جھوم رہی ہے

....

کمال مہارت سے معاشی استحصال اور سماجی رویوں کو قلم بند کرتے ہیں۔
"پہاڑی راستے پر ایک قیام گاہ، تم کہاں ہو" میں ایک طالب علم کی موت کو نظم میں ڈھالا۔ "شال" کے منہ سے اس کا دکھ بیان کرتے ہیں تو "کرۂ امتحان" میں زندگی ہے یا اجل ہے:

فیصلے میں جو لکھا جائے وہی تصویر ہے
اور جو کیا جائے وہی تقدیر ہے

....

"ماں مجھے بتاتی ہے" بہت عمدہ اور رواں نظم جس میں ماں نے سکول سے لے کے گھر کی ایک ایک تفصیل جس پیار سے بتائی ہے وہ ڈاکٹر صاحب کے سنانے میں الگ ہی خوشبو بکھیرتی ہے ایسے لگتا ہے وہ انہی دنوں میں لوٹ جاتے ہیں جہاں "ماں" تھی۔

جن نے شاہزادی کو قید کر کے رکھا تھا
تم اس کہانی میں راجہ بن کے آتے تھے

....

اگلی نظم میں اپنے بیٹے کے لیے کہتے ہیں:

میں چونک اٹھا پرندے کی صدا سے
مرے بیٹے نے پہلی بات کی ہے

میں تیرے جسم میں زندہ رہوں گا
مری پہچان میرے بعد بھی ہے

....

بہت سادہ لہجے میں کیفیات کو نظم کرنے کی مہارت گرفت میں لیتی محسوس ہوتی ہے۔

سیلاب کے لیے لکھتے ہیں۔

میں نے کشتی سے کھلے پانی میں دیکھا شاہد
موج اچھلی تو کئی پھول سے بچے ابھرے

....

آٹھ اکتوبر کے زلزلے کو یوں نظم کے حوالے کرتے ہیں۔

میں یہاں ہوں نکالو خدارا مجھے
کوئی سنتا نہیں ہم نشیں سو گئے

ڈیسک پر سب کتابیں کھلی رہ گئیں
بنچ پر بیٹھے بچے وہیں سو گئے

....

اسی طرح ''کفن پوش جلوس، گوٹھ سکوں آباد، ڈائری، دھند، ایک منظر، چاغی مہک اٹھا، وادی، ایک لیڈر کی موت، دریائے اردن، اور رنگ خوابیدہ پڑے ہیں بہترین نظمیں ہیں۔

رنگ خوابیدہ پڑے ہیں
اس لیے تصویر کو اونگھ آ گئی ہے

....

میرے قاتل کو پتا ہے
کیوں یہ خوں بکھرتا تو کوئی شہکار بنتا
اس لیے خوں فرش پر بکھرا پڑا ہے
(گل جی کے لیے)

آبادی پر نظم، میرے بعد میں ''میر'' کا دکھ، سمٹتے پھیلتے نقطے، بہت ہی اعلیٰ نظم ہے اور طوالت میں عجیب سحر طرازی ہے۔

درختوں پر بہت سے نام لکھے ہیں''، نئے گھر میں پہلا دن، اس کتاب کی نمائندہ نظم ہے۔

ایک کمرے سے کشادہ گھر میں آنے تک
مجھے چالیس برسوں کا سفر کرنا پڑا ہے
میں اگرچہ خوش ہوں لیکن
میرا کمرے میں بہت کچھ رہ گیا ہے

....

ہر سطر لاجواب ہے، بار بار پڑھی جانے والی۔ ''ایک چھتنار کے نیچے کھڑا ہوں''، لمحے کی تلچھٹ،، یہ مطلوبہ قبر نہیں ہے، وبا سے بچ گیا تو، ابھی رنگ گیلے ہیں، گلے میں لگا پودا، گل لالہ، تجاوزات، ڈیجیٹل لائف، مدتوں بعد کوئی بات ہوئی، عید اور کرسمس، مسنگ پرسن، سال نو کی رات اور شاعر واپس نظمیں واپس لے لو میں برما کے مسلمانوں کا دکھ، چڑیل نامہ، احتراماً ذرا سا جھک گیا ہوں، حمایت نہ کرو۔ یہ سب بہترین نظمیں ہیں۔ یہ کتاب تقریباً ستر نظموں پر مشتمل ایک خوشبودار گلدستہ ہے۔ جس کا انتساب ڈاکٹر شاہد اشرف نے اپنے (مرحوم) بھائی کے نام کیا ہے۔ شاعری ایسے ہی دکھوں سکھوں۔ کیوں تبھی دانتی جیسی محسوسات کا مجموعہ ہے۔ جسے مثال پبلشرز نے بہت دیدہ زیب پیرہن میں زینت دی ہے۔

☆☆☆☆☆

اگرتلا: فکشن اور تاریخ کا اسلوبیاتی ملاپ

"اگرتلا ایک ناول ہے"! یہ کہنا غافر شہزاد کا ہے، جو ناول نگار ہیں۔ اس سے پہلے اُن کے چھ ناول چھپ کر اپنے قارئین سے مقبولیت اور قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ساتواں ناول "اگرتلا" ہمارے سامنے ہے؛ جب کہ آٹھواں ناول "پالنہار" اس وقت طباعت کے مراحل سے گزر رہا ہے اور امید ہے کہ اگلے دو تین ہفتوں میں یہ ناول قاری کے ہاتھوں میں ہوگا۔

غافر شہزاد نے اپنے ناول کا نام "اگرتلہ" کے بجائے "اگرتلا" رکھا ہے۔ اگرتلہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) اور ہندوستان کی سرحد پر واقع ایک شہر ہے جس کا ذکر تاریخ میں اس حوالے سے ہوتا ہے کہ وہاں مبینہ طور پر 1960 کی دہائی کے آخری برسوں میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی سازش تیار کی گئی تھی۔ صدر پاکستان محمد ایوب خان کے دور میں "اگرتلہ سازش کیس" عدالت میں بغیر کسی کردار کو سزا دلوائے ختم کر دیا گیا تھا جس کے پیچھے مختلف انواع کے سیاسی دباؤ تھے۔

لفظ "اگرتلہ" کو "اگرتلا" لکھنے کا مقصد ناول نگار کا یقینی طور پر یہ ہے کہ وہ اسے ہندوستان کے شہر سے الگ کر کے ایک بڑی سطح پر علامت بنانا چاہتا ہے تا کہ ناول کا دائرہ کار صرف "اگرتلہ سازش کیس" تک محدود نہ رہ جائے بل کہ اس سازش کی بنیاد پر پاکستان کی تاریخ میں ملتی جلتی کئی اور سازشیں ناول کی کہانی کا اس طرح سے حصہ بن جائیں کہ پاکستان کی سیاسی سماجی اور تاریخی صورتحال کھل کر قاری کے سامنے آجائے۔ اب یہ قاری پر منحصر ہے کہ وہ ناول پڑھنے کے بعد کیا اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ناول نگار نے اپنے فن کے ساتھ انصاف کیا ہے یا اس میں ناکام رہا ہے؟

اگرتلا موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے کوئی

شاہدہ دلاور شاہ

روایتی ناول نہیں ہے۔انگریزی زبان میں میٹا فکشن کا آغاز تو 1960 کی دہائی میں ہو چکا تھا جسے بعد میں مابعد جدید فکشن بھی قرار دیا گیا؛جس کی ایک خوبی یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اس میں تاریخ فکشن کے ساتھ گھل مل کر ناول کا ساختیاتی حصہ بناتی ہے اور شامل کی جانے والی کہانی تاریخ کے حقائق کے ساتھ مل کر ایک دوسرے کو سپورٹ کرتی ہے۔ یہاں یہ دیکھنے کی بھی ضرورت ہے کہ اردو میں اس اسلوب میں کتنے ناول لکھے گئے ہیں جس میں تاریخ کو ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ نسیم حجازی کی تاریخی ناول ناول نگاری الگ قسم کی ہے جس میں چند تاریخی واقعات کو فکشن کے ساتھ ملا کر مسلمان سپہ سالار کی شخصیت سازی کی جاتی رہی ہے۔ بے شک عبدالصمد کا ناول ''دو گز زمین'' اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں ایک ہندوستانی مسلمان خاندان پر تقسیم ہند اور ہجرت کے اثرات پیش کیے گئے ہیں۔ یوں سیاسی اور سماجی تناظر میں معاشرتی صورتحال ناول میں پیش کی گئی ہے۔ ویسے تو نیر مسعود کا ناول ''طاؤس چمن کی مینا'' اور انیس اشفاق کا ناول ''پری ناز اور پرندے'' بھی اسی کیٹگری کا ناول ہے جس کا بنیادی کردار کالے خان مغلیہ عہد کے آخری برسوں کے معاشرتی ،سیاسی اور اقتصادی تنزل کو احسن طریقے سے پیش کرتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو اگر تلا ناول سیاسی صورتحال کی پیشکش کو فکشن کے ساتھ مدغم نہیں کرتا بل کہ اس کے متوازی ساتھ ساتھ چلاتا ہے تا کہ اس تناظر میں کرداروں کی نفسیاتی اور سماجی کیفیات کو سمجھنے میں مدد ملے۔

ناول پڑھتے ہوئے ایک سوال یہ بھی ذہن میں آتا ہے کہ عافر شہزاد کو ناول لکھنے کے بجائے پاکستان کی تاریخ لکھنا چاہیے تھی، اس ناول کی تہ میں بظاہر یہی مقصدیت دکھائی دیتی ہے۔ اس سوال کے جواب میں عافر شہزاد نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا ہے: '' تاریخ کو پیش کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے کہ اس کا قاری موجود نہیں ہے اور اس میں بہت سی حدود وقیود آڑے آتی ہیں ، پھر بھی درست صورتحال سامنے نہیں آ پاتی ۔ پاکستان کی تاریخ کو ایسے کرداروں کے ساتھ جوڑ کر پیش کرنا کہ جو سیاست کی بساط کے عملی شاہ سوار ہیں، اصل کام ہے جو فکشن میں ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ تاریخ کا کینوس بہت محدود اور یک سمتی ہوتا ہے جبکہ اس کے اثرات معاشرے پر کثیر سمتی دکھائی دیتے ہیں اور ویسے بھی وقت کو زمان و مکان کی حدود سے ورا پیش کرنے کی گنجائش صرف مابعد جدیدیت کے فکشن میں ہی نکلتی ہے''۔

اگر تلا ناول کا اہم ترین کردار ایک بیوروکریٹ ہے جسے ناول میں علامتی سطح پر روبوٹ کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ سرکاری ٹریننگ کے بعد افسران کسی بھی اختیارات والی سیٹ پر بیٹھیں تو ایک جیسا ہی کردار ادا کرتے ہیں اور جو انھیں احکامات ملتے ہیں، ان پر روبوٹ کی طرح عمل

درآمد کے پابند ہو جاتے ہیں۔ انھیں تابع فرمان کہا جاتا ہے۔ کچھ افسروں کے اندر سرکاری نوکری کے دوران سوالات ابھرتے رہتے ہیں اور وہ خود کو ہر روز اپنے ضمیر کے کٹہرے میں کھڑا کیے رکھتے ہیں۔ پھر ایک دن ضمیر غالب آ جاتا ہے اور وہ روبوٹ سے ایک انسان بن جاتے ہیں جس کی سزا انھیں بھگتنا پڑتی ہے۔ اس ناول کا روبوٹ کردار جس کی ملازمت سے سبک دوشی کو چند ہفتے باقی ہیں، ایسی ہی سخت سزا کے عذاب سے گزرتا ہے۔

مابعد جدیدیت کے حامل ناول اپنے اندر کوئی ایک مرکزی کردار نہیں رکھتے بلکہ کئی ایک حاشیے کے کردار آپس میں مل کر ایک کہانی کو نہیں بلکہ ایک صورتحال کو پیش کرتے ہیں۔ ویسے بھی کسی ایک کردار کا مرکزی مقام حاصل کرنا دراصل آمریت کے زمانے کی پیداوار ہے۔ جمہوریت میں اختیارات کسی ایک فرد کے اندر مجتمع نہیں ہوتے بلکہ تقسیم در تقسیم ہوتے ہیں اور ہر کردار اپنے وقت اور مقام پر ویسے ہی اہم ہو جاتا ہے۔ غافر شہزاد نے اس ناول میں بھی کئی کردار یہاں تک کہ ریاست پاکستان کو بھی ایک کردار کے طور پر ساتھ ساتھ پیش کیا ہے جو اپنا احوال خود بیان کرتی چلی جاتی ہے اور اس کے متوازی فعال کردار ادا کرنے والے عدلیہ، مقننہ، انتظامیہ اور مقتدرہ کے لوگ شامل ہیں۔ ناول میں ریاست اپنا مقدمہ ایک کردار بن کر قاری کے سامنے خود پیش کرتی ہے۔

پاکستان کی سیاسی صورتحال میں پریس کانفرنس ہمیشہ سے اہم رہی ہے جہاں چار دیواروں کے اندر ہونے والے فیصلے اور مباحث کو حتمی نتیجے پر پہنچنے کے بعد ایک خاص زاویے سے عوام تک پہنچایا جاتا ہے مگر اس ناول میں پریس کانفرنس نے اپنے کردہ اور ناکردہ افعال کی ذمہ داری قبول کرنے کا سٹیٹس حاصل کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی اس پریس کانفرنس کا تذکرہ بھی ملتا ہے جس کے سبب حکومت پاکستان نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو امریکہ کے حوالے کیے جانے سے بچا لیا۔

جمہوری اداروں میں ہونا تو یوں چاہیے کہ سب ادارے اپنے اپنے اختیارات اپنی حدود میں رہ کر استعمال کریں مگر پاکستان میں بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا۔ ہر ادارہ دیگر اداروں کی حدود میں تجاوز کرتا رہا ہے، جس کے سبب ترقی کا سفر بے سمتی کا شکار رہا ہے۔ ناول میں اس طرف بھی اشارے ملتے ہیں کہ اس وقت کوئی ملک بھی اپنی جغرافیائی حدود کے اندر رہتے ہوئے آزادانہ طور پر اپنے لیے اور اپنے عوام کے بہتر مستقبل کے لیے فیصلے نہیں لے سکتا۔ اس کو جغرافیائی حدود کے باہر موجود دیگر ہمسایہ ملکوں کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر طاقتور قوتوں کے ساتھ مل کر چلنا پڑتا ہے اور ان کی ترجیحات کو نظرانداز کرنا بہت سی مشکلات کا سبب بن سکتا ہے جو اس وقت

پاکستان کو درپیش ہیں۔ پاکستان نے اسلامی ملک ہوتے ہوئے اپنا تشخص بھی بچانا ہے اور اس کے ساتھ عالمی قوتوں کے ساتھ تعلقات بھی قائم رکھنے ہیں۔ یہ تو ایک پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے۔ ہمیشہ جنگوں سے ہی مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے بعض اوقات حکومتی پالیسی بغیر کسی جانی و مالی نقصان کے، ایسے نتائج لے آتی ہے جس کی تمنا ہی کی جاسکتی ہے۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اس وقت پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا نے چوتھے ستون کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ سوشل اور الیکٹرانک میڈیا ایک مہلک یا مفید ہتھیار کے طور پر موثر انداز سے اپنا کردار ادا کرتا ہے؛ ناول میں اس جانب خصوصی اشارے ملتے ہیں کہ کس طرح سوشل میڈیا سچ اور جھوٹ کے درمیان حد امتیاز ختم کر کے عوام کو سچائی سے دور رکھتا ہے تاکہ مقتدر قوتیں اپنے مقاصد حاصل کر سکیں جو ان کے نزدیک ریاست کی سلامتی کے لیے لازم ہیں۔

ناول میں مغربی پاکستان میں بسنے والے ایک خاندان کی تین نسلیں اپنا کردار ادا کرتی نظر آتی ہیں: پہلی نسل نے پاکستان بنانے میں، دوسری نسل نے سرحدوں کی حفاظت میں، اور تیسری نسل نے انتظامیہ کے ایک اہم افسر کی حیثیت میں اس ملک کی خدمت کی ہے جو ان کے محب الوطن ہونے کی غماز ہے۔ ناول کے اندر پاکستان میں جمہوریت اور آمریت کے سلسلے میں جس طرح اداروں کو ری سٹرکچر کیا گیا اور مطلوبہ نتائج حاصل کیے گئے، پھر بھی روشنی پڑتی ہے جس کا مقصد ایک حد تک تجزیہ بھی ہے۔

جس طرح کوئی بھی معاشرہ اور اس کے افراد اپنے مذہبی نظریات تعصبات اور اعتقادات کے بغیر، علاحدگی میں نہیں دیکھے جاسکتے اسی طرح آج طرز حکومت کے بغیر کسی بھی ملک کے عوام اور ان کی مادی ترقی کو سمجھنا کافی مشکل کام ہے۔ اس ناول کے سبھی کردار مختلف طرز کی حکومتوں کے موثر اور فعال کردار ہیں جو اپنی طاقت کا اظہار اپنی سلامتی اور موجودگی کو قائم رکھنے کے لیے کرتے رہتے ہیں۔

سیاسی نظریات اور مذہبی تعصبات کا پرچار کرنے والے ناول کے ان کرداروں کو ساتھ لے کر چلنا بہت مشکل کام تھا اور کئی مقامات پر یوں لگتا تھا کہ ناول فکشن کی حدود سے باہر نکل جائے گا اور شاید کچھ جگہوں پر ایسا ہوا بھی مگر موضوع اور سمت کے تعین کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں ناول نگار کو تھوڑی چھوٹ دینا پڑے گی۔

ایک مابعد جدید ناول کسی حتمی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو جاتا ہے جو اس جانب اشارہ ہے کہ معاملات ایسے ہی چلتے رہیں گے کچھ لوگوں کو قربانیاں دینا پڑیں گی کچھ لوگ قربانیاں لیں گے اور کچھ لوگ اپنا کردار عام آدمی کی طرح ادا کرتے ہوئے رخصت ہو جائیں گے۔

☆☆☆☆☆

گوجر خان میں اُردو غزل کی روایت

گوجر خان میں اُردو شاعری کے رواج سے قبل چند ایک فارسی اور پنجابی زبانوں کے قدیم شعرا کے نام ملتے ہیں فارسی شعرا میں دسویں اور گیارویں صدی ہجری کے شیخ قطب الدین کا تعلق جلہاری بھائی خان سے تھا چند بندوں پر مشتمل اُن کا ایک خمسہ اُن کے اخلاف میں عبداللہ سہام نے اپنی تصنیف: اسرار المحبت (سال تصنیف: ۱۱۲۰ھ) میں نقل کیا ہے

گیارویں اور بارھویں صدی ہجری کے چند اور فارسی و پنجابی شعرا میں میاں محمد برکات قریشی (جلہاری بھائی خان)، شیخ عاشق محمد (جلہاری بھائی خان)، شاہ چراغ مشہدی (سید کسراں، مدفون: راول پنڈی)، شاہ محمد چراغ گیلانی (کانیٹ تاج خان، مدفون: چوہان سیداں/ چکوال)، رائے زادہ دونی چند (م: ۱۱۵۲ھ، گلیانہ)، عبداللہ سہام (جلہاری بھائی خان)، رائے زادہ برج ناتھ (گلیانہ) اور رائے زادہ بودھا مل (م: ۱۸۵۵ست، کانیٹ تاج خان) کے نمونہ ہائے کلام دست یاب ہیں۔

عبداللہ سہام (۱۰۸۹-۱۱۷۰ھ) گوجر خان کے پہلے اُردو شاعر ہیں اُردو کے علاوہ فارسی اور پنجابی میں بھی اُن کا کلام محفوظ ہے اُن کا خاصا فارسی کلام اُن کی تصنیف: اسرار المحبت میں نقل ہوا ہے اور مذکورہ بالا تصنیف ہی میں ایک بیت اُن کی ایک سی حرفی ہیر رانجھا سے بھی درج کیا گیا ہے اُن کی اُردو مثنوی: گلزار محبت کے اب تک تین نسخے دریافت ہوئے ہیں یہ مثنوی انھوں نے ۱۱۶۱ھ میں مکمل کی تھی راقم الحروف نے ہر سہ نسخوں کے تقابل کے بعد اِس کا تحقیقی متن مدون کر لیا ہے جو اِسی سال شایع ہو جائے گا۔

تیرہویں صدی ہجری میں گلیانہ کے ایک اور مورخ رائے زادہ رتن چند ولد سلامت رائے کا فارسی، پنجابی اور اُردو کلام ملتا ہے سید محمد شاہ مشہدی ملقب بہ مولوی کا تعلق موضع سید سے تھا اور وہ فارسی زبان کے قادر الکلام شاعر تھے انھوں ۱۲۳۰ اشعار

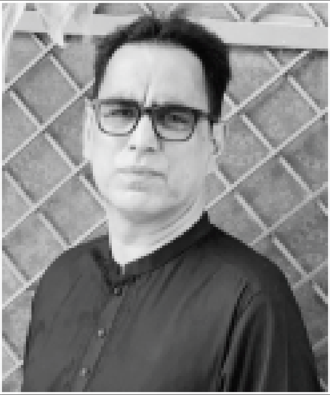

حسن نواز شاہ

پر مشتمل نے اپنے خانوادے کا منظوم فارسی: نسب نامہ سادات مشہدی کہا تھا، جس کے قلمی نسخے دست یاب ہیں۔

موضع لودے کے قاضی فضل الدین علوی نقشبندی اور قاضی علم الدین علوی نقشبندی دونوں فارسی اور پنجابی کے شعرا تھے اُن کے اخلاف میں مولانا محمد گوہر علی علوی، مولانا محمد عصام الحق علوی اور قاضی ارشاد الٰہی متخلص بہ فیضی بھی عربی اور فارسی زبانوں میں شعر کہتے تھے شاہ محمد وجیہ السیما عرفانی (م: ۲۲ فروری ۱۹۹۱ء)، جن کا مزار سندر لاہور میں ہے، مولانا محمد گوہر علی علوی کے بھتیجے اور شاگرد تھے وہ موضع لودے ہی میں پیدا ہوئے تھے، اُن کی غزلیات کے دو مجموعے: حرف جمال اور نوائے سروش شائع ہو چکے ہیں۔

قیام پاکستان سے قبل یہاں کے غیر مسلم شعرا میں موضع دیوی کے ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اور موضع سید کے سنت ورشن سنگھ (۱۹۲۱-۱۹۸۹ء) کے نام ملتے ہیں دونوں حضرات قیام پاکستان کے وقت ہندستان ہجرت کر گئے تھے ڈاکٹر دیوانہ کا مجموعہ: کیفیات اور سنت ورشن سنگھ کا: جادۂ نور، طبع ہو چکے ہیں یہاں ضمناً یہ بھی بیان کرتا چلوں، معروف نومسلم شاعر چودھری دلورام کوثری = چودھری کوثر علی (م: ۲۸ دسمبر ۱۹۳۱ء) کچھ عرصہ موضع سید میں مقیم رہے اس حوالے سے موضع سید ہی کے شاعر اور محقق غلام حسن کسری منہاس (م: ۲۹ نومبر ۱۹۹۵ء)، راوی ہیں:

"اُردو ادب کے مشہور ادیب محقق اور تاریخ گو جناب غلام کسریٰ منہاس (مرحوم) بیان کرتے ہیں کہ کوثری اُن کے وطن سید کسراں (ضلع راول پنڈی) میں اُن کے والد غلام نبی منہاس کے یہاں قیام پذیر رہتے تھے اور اُس زمانے میں اُنھوں نے روضۃ الشہدا کے فارسی متن کی تلخیص کر کے جو نسخہ تیار کیا تھا وہ مدتوں اُن کے قصبے میں مجالسِ عزا میں پڑھا جاتا رہا ہے"

قیام پاکستان سے قبل گوجر خان میں اُردو غزل گوئی کی روایت کے حوالے سے بہت کم لوازمہ میسر ہے لے دے کے محمد فاضل غمناک (م: ۱۹۴۰ء) کا ایک نام ملتا ہے جن کا غیر مطبوعہ کلام ایم فل کے لیے مرزا تجمل حسین جرال (وفاقی اُردو یونی ورسٹی اسلام آباد) اور ڈاکٹر محمد اکرام قریشی (علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد) نے مرتب کیا ڈاکٹر اکرام کا مرتبہ دیوان نوابی گرافکس واہور/ گجرات (بھارت) سے ۲۰۲۱ء میں شائع ہو چکا ہے یہاں اس امر کی نشان دہی البتہ لازم ہے کہ غمناک اور اُن کے کلام کی دریافت کا سہرا نوجوان محقق، شاعر اور صحافی فیصل عرفان کے سر جاتا ہے، سب سے پہلے اُنھوں ہی نے مذکورہ شاعر کے تعارف و انتخاب کلام پر اپنا مضمون نوائے وقت کے سنڈے میگزین میں شائع کرایا تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد ابتدائی عشروں میں گوجر خان میں اُردو غزل کے حوالے سے

اختر امام رضوی، خواجہ یعقوب شاکر، حسن خان چوہان (ڈھوک چوہان)، صاحبزادہ ڈاکٹر محمد حسین انصاری للہی (گوجر خان شہر)، حاجی عزت شاہ وارثی (چھپر)، زمان مہدی قاصر (موہڑہ دھمیال) اور علامہ غلام مصطفیٰ رعنا رام پوری (گوجر خان شہر) کے نام ملتے ہیں۔

صاحبزادہ ڈاکٹر محمد حسین انصاری للہی کے کلام کی دو بیاضیں اُن کے اخلاف کے ہاں محفوظ ہیں، جب کہ حاجی عزت شاہ وارثی کے کلام کا انتخاب: مشتے نمونے از خروارے، کے نام سے شائع ہوا تھا علامہ رعنا رام پوری کے چند کلام، اُن کی تصنیف: کشف الاسرار و اعمال الابرار کے آخر میں شائع ہوئے تھے۔

حسن خان چوہان پولیس میں ملازم رہے اور اُن کا زیادہ تر وقت اٹک میں گزرا، یہی وجہ ہے نذر صابری مرحوم کے مرتبہ طرحی مشاعروں کے انتخاب اور تنقیدی نشستوں کی رواداوں پر مشتمل رجسٹروں میں اُن کا ذکر ملتا ہے، البتہ گوجر خان کے ادبی حلقے اُن کے نام اور کام سے نا آشنا ہی رہے اُن کے کلاموں کی تین بیاضیں مخدوم امیر جان لائبریری نڑالی میں محفوظ ہیں اور کلر سیداں کے نوجوان محقق: فاران نظامی، اُن کا کل کلام مرتب کر چکے ہیں جو ہنوز منتظر اشاعت ہے۔

عالمی شہرت یافتہ صوفی دانشور پروفیسر احمد رفیق اختر بھی غزل کہتے تھے اور اب بھی نجی نشستوں میں کبھی کبھار اوائل عمری کی غزلیات سناتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد شعرا کی دوسری کھیپ میں: عابد سعید عابد، رشید جاوید، سید نسیم تقی جعفری، مسعود جاوید، نذیر حسین بٹ، مزمل رشید شاد، رحمان حفیظ، اشفاق طاہر چوہان، احمد اصغر راجا، زوار فاطمی، جمال صدیقی، پیر بخش دہلوی، تراب نقوی، انصر امام بخاری، ثاقب امام رضوی، احمد ادریس، بشارت عاصم، احمد نسیم راجا، تجمل جرال، آل عمران، شیراز اختر مغل، ماجد وفا عابدی، سید آل عمران، امتیاز گلیانوی، احمد عرفان اور راقم الحروف شامل ہیں۔

بعد کی کھیپ میں نوجوان شعرا کی طویل فہرست ہے، میں جسے اپنے حافظے کی بنیاد پر یہاں نقل کرتا ہوں، اگر کوئی نام رہ جائے تو اسے میری کم علمی یا نسیان کا نتیجہ سمجھنا چاہیے: پیر عتیق احمد چشتی، ڈاکٹر اسد منیر، فیصل عرفان، نصیر احمد چشتی، سید جاوید بخاری، محراب خاور، حامد نواز شاہ سہروردی، علامہ محمد سجاد احمد ساجد، خیال نصیروی، رضاء اللہ سعدی، آفاق خالد، عاصم ندیم، ہمایوں مرزا، اعظم مہراز، ذوہیب کاظمی، اسد کاظمی، حمزہ رفعت، قاسم علی قاسم، آصف خاکی، شاکر دولتالوی، عدیل نازش، علی اصغر، احمد وقاص، نیاز علی، محمد فیاض شاہ، زبیر احمد وارثی، فہد سرشار کیانی، جنید غنی راجا، اویس راجا، اذان علی، راشد محمود شام، ضیاالحسن ضیا (مرحوم)، تمکین تابانی، ڈاکٹر محمد اکرام

قریشی، غلام عباس، ندیم انجم کیانی، ندیم روشن، سجاد حیدر، اور محمد اخلاق شامل ہیں۔
گوجر خان کی تنظیم: قندیلِ ادب کے اراکین شعرا کا پہلا انتخاب: سخن ستارے کے نام سے ۱۹۸۵ء میں شایع ہوا کتاب کا سرورق ملک کے معروف مصور، خطاط اور نقاش صادقین (م: ۱۰ فروری ۱۹۸۷ء) نے بنایا تھا اس کے مرتب سید نسیم تقی جعفری تھے اس انتخاب میں خواجہ یعقوب شاکر، مسعود جاوید، عابد سعید عابد، رشید جاوید اور سید نسیم تقی جعفری کی غزلیات شامل ہیں۔
سخن ستارے کے بعد گوجر شہر کے باسی راجا اشفاق احمد چوہان (بعد ازاں: راجا اشفاق طاہر چوہان) کا مجموعہ: شبنم روئے گلاب ۱۹۸۸ء میں شایع ہوا، اُن کا دوسرا مجموعہ: حرف حرف زندگی فروری ۱۹۹۱ء میں چھپا تھا
رشید جاوید شہر کے بزرگ اور انقلابی شاعر تھے، اُن کا ایک ہی مجموعۂ کلام: اُجالوں کے تعاقب میں (جنوری ۱۹۹۴ء) میں بہ اہتمام و انتخاب رحمان حفیظ، حق برادرز لاہور سے شایع ہوا۔
احمد اصغر راجا کا تعلق مانکیالہ برہمناں سے ہے، اُن کا پہلا مجموعہ: لوحِ سخن دسمبر ۱۹۹۶ء میں شایع ہوا بعد ازاں: خوشبو بھرا جنگل، (۱۹۹۸ء، ترتیب و انتخاب رحمان حفیظ) پلکیں اور آواز، (۲۰۰۱ء)، دُھند میں سورج (۲۰۰۴ء) اور کرب احساس (۲۰۰۵ء) دُھند میں سورج، در اصل بقیہ چار مجموعوں کے انتخاب پر مشتمل ہے اگرچہ اِس کا سال اشاعت ۲۰۰۴ء ہے اور چوتھے مجموعے: کرب احساس پہ سال طباعت ۲۰۰۴ء درج ہے
ماجد وفا عابدی کا تعلق گلیانہ سے ہے، ۲۰۰۳ء میں اُن کا پہلا مجموعۂ کلام: تصویرِ آب، احباب پبلی کیشنز سرگودھا سے چھپا۔
قاضی ظفر گلیانوی کا آبائی تعلق بھی گلیانہ سے تھا، البتہ وہ ایک عرصے سے گوجر خان میں مقیم تھے، اُن کا ایک ہی مجموعہ: سُوکھے پتے گلیوں میں، اپریل ۲۰۰۶ء میں شایع ہوا
اختر امام رضوی (م: ۲۰ اکتوبر ۲۰۱۸ء) کا تعلق گوجر خان شہر سے تھا وہ ایک بڑے شاعر، بڑے انسان اور ملک بھر میں کئی حوالوں سے گوجر خان کا تعارف و پہچان تھے اُن کا ایک شعری مجموعہ: اے شام کی تنہائی، ۲۰۰۸ء میں شایع ہوا۔
احمد ادریس گوجر خان شہر سے ہیں، اُن کا مجموعہ: ہرے لفظوں کی خوشبو، سنگِ میل پبلی کیشنز سے ۲۰۰۹ء میں شایع ہوا۔
خواجہ یعقوب شاکر کا تعلق گوجر خان شہر سے تھا اور اُن کا شمار بزرگ شعرا میں ہوتا تھا اُن کا مجموعہ: دُھوپ بارشوں کے بعد، ۲۰۰۹ء میں سنگِ میل پبلشرز لاہور سے شایع ہوا۔
سید نسیم تقی جعفری بھی گوجر خان شہر سے ہیں، اُن کا پہلا مجموعۂ کلام: چمن پھولوں سے خالی ہو گیا ہے، ۲۰۱۰ء میں شایع ہوا۔
صوفی محمد عارف ادیب کیانی کا تعلق کرنالی سے تھا، وہ اُستاد شاعر تھے اور علامہ ذوقی

مظفر نگری کے شاگرد تھے زندگی کے آخری برسوں میں اُنھوں نے خود کو محض پوٹھوہاری شاعری کے لیے وقف کرلیا تھا اُن کی وفات کے بعد اُن کے شاگرد زاہد کلیم (مظفر آباد) نے: کیف و کرب، کے نام سے اُن کا کلام ۲۰ نومبر ۲۰۱۳ء کو نیلم پبلی کیشنز مظفر آباد سے شائع کیا۔

نظام الدین نظامی (م: ۱۵ جنوری ۲۰۱۳ء) پنجگراں خرد کے بزرگ شاعر تھے، اُن کی وفات کے بعد اُن کے اُردو کلام کا انتخاب: فغانِ نظامی کے نام سے ۲۰۱۴ء میں طبع ہوا۔

جواں مرگ شاعر سید آلِ عمران کی غزلیات کا مجموعہ: کوئی عکس تھا کوئی خواب تھا، اُن کی حیات ہی میں طبع ہوا تھا، بعد ازاں اُن کے مجموعے سے ایک انتخاب: موسموں میں ڈھونڈ مجھے، کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

شکور احسن کا تعلق گوجر خان شہر سے متصل ایک چھوٹے سے گاؤں پنڈوڑہ سے ہے اُن کا پہلا شعری مجموعہ: آنکھیں پڑھ لیں، جون ۲۰۱۶ء شائع ہوا۔

انصر امام بخاری (م: ۷ اپریل ۲۰۱۷ء) بھی شہر سے تھے اُن کا مجموعۂ کلام: رات دِیا اور میں، سائل نظامی کے اہتمام و ترتیب سے مارچ ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا۔

سائل نظامی، گوجر خان شہر کے نوجوان شاعر ہیں اور ان دنوں بہ سلسلہ روزگار ملائیشیا میں مقیم ہیں اُن کا پہلا مجموعۂ غزلیات: چراغ دروں در، نومبر ۲۰۱۹ء میں چھپا تھا۔

اکرام رشید قریشی کا تعلق دولتالہ سے ہے اور پاکستان نیوی کی طرف سے ان دنوں سعودی عرب میں مقیم ہیں، اُن کا مجموعہ: خزاں کی شام، رنگِ ادب کراچی سے مئی ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا۔

اِسی طرح درج ذیل شعرائے کرام کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں: عابد معروف مغل: اِس شہرِ بے اماں، ایک تصویر ہے محبت کی، صدیق وارثی: جھنوا، ستارہ بولتا ہے، محمد یوسف قمر: اجنبی دوست ہوئے، فیض عالم خان فیض چنگوی: تقدیسِ افکار، حفیظ اختر راجا: زرناب، اقبال طارق: تمھارے قرب کا موسم، آنکھوں میں شام، بن تمھارے اُداس کوئی نہیں، محمد اقبال بھٹی: ماں کے اندر ایک سمندر، جہانگیر اشرف: ہوئے خواب سب سراب، موسم بدلے گا، اخلاق حسین ساقی: ساحل ہے لہولہو، سعید راجا: اُس کی آنکھیں بتا سکتی ہیں، رقصِ ہوا، جمیل حیدر عقیل: نقوشِ غم، شاخِ مرجان، چراغِ حجرۂ شب، غلام رضا شاکر: طلوع، علی عمران کاظمی: روداد، ڈاکٹر احمد فاروق: آدھی بارش، مسعود سلیم زاہد: آہستہ آہستہ، محبت درد ہے، قاضی شفیق الرحمٰن: نوائے عارف، تابندہ مسعود: سلگتا دشت، محمد فہیم: سلگتے خواب، اجنبی شام، عکسِ جاناں، وعدہ رہا، ناتکمل)، قاضی عنایت الرحمٰن: ردائے کمال اور نور الحق راہی: میں نے سوچا ہے، مجھے سوچنے دو، یٰسین بھٹی:

پھول چنتے ہیں۔
رحمان حفیظ اگرچہ اسلام آباد میں مقیم ہیں مگر اُن کا آبائی تعلق گوجر خان سے ہے وہ ہمارا نہایت اہم ادبی اثاثہ اور فخر ہیں، اُن کا مجموعہ کلام: زنبیل، زیرِ طبع ہے، اُمید ہے اگلے چند ماہ میں شایع ہو جائے گا۔
دولتالہ میں مقیم اختر دولتالوی مزاحمتی شاعری کے حوالے سے اہم شاعر ہیں، اُنھوں نے زندگی کا زیادہ حصہ جھنگ میں گزارا وہ اُردو، پنجابی اور ہریانوی زبانوں میں شعر کہتے ہیں ہر سہ زبانوں میں اُن کے کلیات برادرم فیصل شہزاد (دولتالہ) نے کمپوز کر لیے ہیں۔
نذیر پارس دولتالوی کا تعلق دولتالہ سے تھا مگر وہ راول پنڈی میں مقیم تھے اور وہیں دفن ہوئے اُن کا کلام ہنوز غیر مطبوعہ ہے مگر اُن کے احوال و انتخاب کلام پر فیصل عرفان کا مضمون شایع ہو چکا ہے۔
ولایت حسین حیدری کا آبائی تعلق بھی گوجر خان سے تھا مگر وہ بہ سلسلہ وکالت لاہور میں مقیم تھے وہیں دفن ہوئے اُن کے دو مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔
اُردو اور پوٹھوہاری زبانوں کے شاعر اور براڈ کاسٹر عابد حسین جنجوعہ کی ولادت گوجر خان ہی کے ایک گاؤں موہڑہ پیرو والا داخلی ڈریال میں ہوئی۔ بعد ازاں اُنھوں نے ڈھوک صابری چنڈی روڈ کلر سیداں میں رہائش اختیار کر لی اُن کا اُردو مجموعہ زیرِ طبع ہے۔

معروف و مقبول شاعر حسن عباس رضا کا آبائی تعلق بھی گوجر خان ہے، اُن کی رہائش وارڈ نمبر ۲ عقب مسلم بوائز ہائی سکول گوجر خان میں تھی اُن کے والدِ گرامی صوفی محمد زمان گوجر خان مسلم سکول میں اُستاد رہے ہیں۔
حسین ثاقب کا تعلق کوتریلہ سے ہے وہ ان دنوں لاہور میں مقیم ہیں اُن کے دو مجموعے، آخری آوارگی اور گلابی خطوں کے سرنامے، شایع ہو چکے ہیں
پروفیسر کرم حیدری، قیام پاکستان سے قبل خالصہ سکول دولتالہ میں اور قیامِ پاکستان کے بعد سرور شہید کالج میں بہ طور اُستاد تعینات رہے۔
ماہنامہ نیرنگِ خیال کے مدیر سلطان رشک مرحوم نے فیصل عرفان کو ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ وہ اوائل عمری میں کچھ عرصہ گوجر خان میں مقیم رہے۔
شریف کنجاہی، اُردو و پنجابی زبانوں کے شاعر نیز محقق و نقاد تھے اُنھوں نے بھی کچھ عرصہ سرور شہید کالج میں پڑھایا اور گوجر خان میں قیام کے دوران ادبی حوالے سے بھی متحرک رہے۔
اسلام آباد میں مقیم معروف شاعر رفیق سندیلوی بھی ۸۷-۱۹۸۵ء سرور شہید کالج میں پڑھاتے رہے ہیں اور اُن کے گوجر خان میں قیام کے دوران ہی اُن کا معروف اور مقبول شعری مجموعہ: سبز آنکھوں میں تیر،

۱۹۸۶ء میں شائع ہوا تھا۔

زبیر شفیع غوری معروف محقق اور شاعر تھے وہ کچھ عرصہ سرور شہید کالج گوجر خان میں لیکچرر رہے، اُن کا ایک شعری مجموعہ چھپ چکا ہے

شفیق احمد، دولتالہ کالج میں اُردو کے اُستاد رہے ہیں، اُن کا تعلق لاہور سے ہے اور اُن کے آٹھ کے قریب مجموعے شائع ہو چکے ہیں

نعیم شاہد کا تعلق چکوال سے ہے، وہ ایک عرصہ سرور شہید کالج میں اُردو کے اُستاد رہے اُن کی غزلیات کالج کے مجلّے: کانسی، میں شائع ہوئی تھیں۔

پروفیسر ڈاکٹر عبد الغنی، بھون (کہوٹہ) میں مدفون ہیں وہ اُردو، فارسی اور پنجابی کے اُستاد شاعر تھے، اُنھوں نے کوئی سال بھر دولتالہ کالج میں پڑھایا اُن کی وفات کے بعد اُن کے کلام کا ایک انتخاب شائع ہو چکا ہے یہ بزرگ فنِ شاعری میں راقم کے اُستاد تھے۔

ذکا اللہ شیخ اور اُن کی شریک حیات ہما سہروردی، ان دنوں ساہیوال میں مقیم ہیں وہ ایک عرصہ دولتالہ میں مقیم رہے اور دولتالہ سے شائع ہونے ادبی مجلّے: صبحِ بہاراں کے مدیر تھے دونوں کا کلام صبحِ بہاراں میں گاہے گاہے شامل ہوتا رہا ہے۔

کرنل اسد علی فوجی فاؤنڈیشن کالج گوجر خان کے پرنسپل ہیں اور گزشتہ برس ۹ نومبر ۲۰۲۴ء کو یوم اقبال کی مناسبت سے اُنھوں نے ایک اچھے مشاعرے کا انعقاد اپنے کالج میں کیا تھا، وہ بھی اُردو غزل کہتے ہیں۔

اب اس حصے میں غزلیات کے چند اُن انتخابوں کا نام گنواتا ہوں، جن میں گوجر خان کے شعرا کا کلام بھی شامل ہے: کاروانِ ادب (۱۹۸۹ء)، پہلی دھوپ (۱۹۹۷ء)، غزل آشنائی (نومبر ۲۰۰۵ء)، غزل آفرینی (جولائی ۲۰۰۶ء)، تمھارے ساتھ چلنا ہے (ستمبر ۲۰۰۸ء)، میرا بھی اک چاند، سدا ساتھ تمھارا (مارچ ۲۰۱۶ء)، چراغ (اپریل ۲۰۱۹ء)۔

خطۂ پوٹھوہار سے شائع ہونے والے کئی مجلّات اور اخبارات، جن میں گوجر خان کے شعرا کی غزلیات شائع ہوتی رہی ہیں کے معلوم نام ذیل میں درج کرتا ہوں: تنویر (کلر سیداں)، نگارش (کلر سیداں)، ادبیات (اسلام آباد)، نیلاب (راول پنڈی)، ماہنامہ جام صوفیا (گوجر خان)، مراسم (گوجر خان)، عکاس (اسلام آباد)، عکاس انٹرنیشنل (اسلام آباد)، نیرنگِ خیال (راول پنڈی)، ماہنامہ صبح بہاراں (دولتالہ)، روزنامہ نوائے (راول پنڈی/اسلام آباد)، روزنامہ جنگ (راول پنڈی)، روزنامہ اساس (راول پنڈی)، روزنامہ پاکستان (راول پنڈی)، پندرہ روزہ چشمِ وطن (گوجر خان)، پندرہ روزہ صدائے پوٹھوہار (گوجر خان)، پندرہ روزہ دولتالہ ٹائمز (دولتالہ)، مستقبل (گوجر خان)، کانسی (گوجر خان)، ادراک (گوجر خان)، فہم و ادراک (راول پنڈی) اور قندیلِ نو (نزالی)

☆☆☆☆☆

سخن کی جان...... جان کاشمیری

ریاض ندیم نیازی

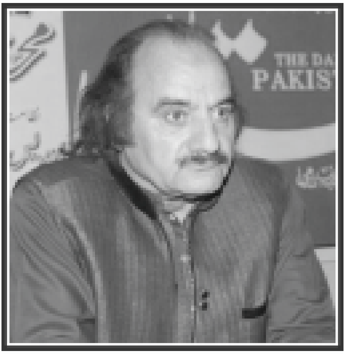

جان کاشمیری کے اشعار کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بہ یک وقت قاری، سامع، ناقد اور مشاہیرِ اُردو ادب کو ادراک کے ساتھ ساتھ انتقادی شعور بھی دیتے ہیں اور اُن کے اشعار قاری کو لطف و سرور، سامع کو غنائیت کی بہار، ناقد کو تفہیم کی رو اور مشاہیر کو وجدانی کیفیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اُن کے اشعار کی بنیاد خوب صورت الفاظ پر ہوتی ہے اور جو شعر میں زورِ سخن پیدا ہوتا ہے اور حُسن و جمال بھر جاتا ہے، وہ بھی پُر تاثیر الفاظ کا مرہونِ منت ہوتا ہے کیوں کہ سماعت پر گراں گزرنے والے الفاظ غزل کا مزاج نہیں رکھتے اور جان کاشمیری نے اِس بات کا خصوصی طور پر خیال رکھا ہے کہ ایسے الفاظ اُن کی غزل میں نہ آئیں جو سننے میں بدذوقی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

جان کاشمیری کی غزلیات میں سب سے اہم چیز جمالِ لفظیات ہے جس کی بنیاد پر وہ معمولی بات کو بھی الفاظ کے حُسن سے حسین و جمیل بنا دیتے ہیں۔ اگر شاعر اچھا ہے تو وہ انسان کے شدید جذبات (پیار، نفرت، غصہ اور خوف)، تلخ و شیریں تجربات، عمیق مشاہدات اور نازک احساسات کو برمحل و موقع الفاظ میں ڈھال دیتا ہے تو اُس کے کلام میں شعریت لازمی در آتی ہے۔ جان کاشمیری نے ایسا ہی کیا ہے۔ انھوں نے اپنے ذہن میں آنے والے خیالات، دماغ پر چھانے والے تصورات اور دل میں راسخ ہونے والے تاثرات کو الفاظ میں ڈھال دیا ہے جس کے سبب اُن کے تمام اشعار میں شعریت در آئی ہے اور اُن میں غنائیت کا حُسن سمٹ گیا ہے۔ اِس لیے کسی شاعر کے لیے لازم ہے کہ وہ جن خیالات و جذبات

اور تخیلات کو بیان کرنا چاہتا ہے اُن کے لیے الفاظ کا انتخاب اُن جذبات وخیالات کی روح کے مطابق کرتا ہے جو عام انداز میں بیان کرنے کی روش سے ہٹ کر دل و دماغ کو اِس طرح اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں جس طرح مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ لفظیات کی مقناطیسیت کا نام شاعری ہے۔ محاسنِ الفاظ شاعری کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں جس کے لیے شاعر کو زبان پر قدرت ہونی چاہیے۔ یہ شاعری کے لیے پہلی شرط ہے اور میں نے جان کاشمیری کے ایک درجن سے زائد شعری مجموعوں کا مطالعہ کیا ہے، اُن کے تمام کلام میں یہ بنیادی خوبی موجود ہے۔ اِس بنا پر میں انھیں گوجرانوالہ کا نمائندہ شاعر تسلیم کرتا ہوں اور شعرائے پنجاب کی اوّل فہرست میں اُن کا نام سرِ محضر لکھتا ہوں، کیوں کہ جو شاعر الفاظ کو اپنا مطیع وفرماں بردار نہیں بنا سکتا وہ اچھی شاعری کا نمونہ زندگی بھر پیش نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں ہزاروں شاعر تخلیقِ شعر میں ہمہ وقت مگن ومصروف رہتے ہیں، مگر ادب کے منظر نامے پر چند شاعر ہی اُبھر کر سامنے آتے ہیں اور وہی شہرت کے آسمان پر چمکتے ہیں اور اپنے پیغامات سے نسلِ نو کو معلومات وآگاہی فراہم کرتے ہیں، اور وہی شاعر اور اُن کا کلام زندہ رہتا ہے، اُن شعرائے اُردو میں جان کاشمیری کا شمار بھی ہوتا ہے۔

خیال کتنا ہی حسین ہو، اس کے لیے حسین الفاظ کا چناؤ، اہم اور ضروری ہوتا ہے جس میں جان کاشمیری کو مہارت حاصل ہے۔ جان کاشمیری اِس دور کے بڑے اور اہم شاعر ہیں، لیکن انھیں ابھی تک وہ مقام نہیں مل سکا ہے جو اُن کا حق ہے۔ اِس کی ایک وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں گروپنگ اور لابنگ اور تعصب پرستی بہت زیادہ ہے۔ ہر صاحبِ اختیار و صاحبِ اقتدار شاعر ہر ادبی کانفرنس، مشاعرے، ادبی مذاکرے اور ادبی پروگراموں اور تقریبِ رونمائیوں میں اپنے ہی گروپ کے شعرا کا نام دیتا ہے اور انھی کو آگے بڑھاتا ہے اور دیارِ غیر بھیجنے کے لیے بھی اپنے بندوں ہی کو پروموٹ کرتا رہتا ہے۔ یہ ادبی بددیانتی کے زمرے میں آتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جان کاشمیری کسی گروپ کا حصہ نہیں ہیں اور نہ وہ کسی لابنگ سے تعلق رکھتے ہیں، یہ بھی اُن کے حق میں بہتر ہے کیوں کہ ایک اچھا اور دیانت دار سخن ور اپنے سخن پر توجہ دیتا ہے اُس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ ادبی سیاست کے لیے اپنا وقت برباد کرے۔ اگر کوئی شاعر ایسا کرتا ہے تو وہ توانا اور پُر تاثیر سخن تخلیق نہیں کر سکتا اور وہ مقدار و معیار میں دیگر عبقری شعرا سے پیچھے رہ جاتا ہے۔

مگر جان کاشمیری کا سخن مقدار و معیار ہر دو لحاظ سے قابلِ ذکر، قابلِ مطالعہ اور لائقِ تحسین ہے۔ انھوں نے غزلیات پر بھرپور

توجہ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے دس شعری مجموعے بہ یک وقت زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئے تو اُردو ادب کی دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی اور ایک نیا ریکارڈ قائم ہوگیا۔ کہنے کو تو یہ بات عام سی ہے کہ دس شعری مجموعوں کی ایک ساتھ طباعت، مگر اُن میں شامل کلام غیر معمولی نوعیت کا کلام ہے جس کی تخلیق میں برس ہا برس صَرف ہوئے ہوں گے اور جان صاحب نے کس قدر دماغ سوزی سے کام لیا ہوگا۔ دل کا لہو فکر کے چراغوں میں جلایا ہوگا تب کہیں یہ سرمایۂ سخن ہاتھ آیا ہوگا۔

جان کاشمیری نے غزل و نظم کے ساتھ ایک نیا اور منفرد تخلیقی کام بھی کیا ہے اور وہ ہے مطالع کی تخلیق، اور ان ہزاروں مطلعوں کی تخلیق کے بعد اُن کو کتابی صورت میں بھی طباعت کی زینت بخشی ہے۔ اُن کی مطالع کی تخلیق غیر معمولی نوعیت کی ہے جو مقدار اور معیار کے لحاظ سے سب سے الگ، منفرد اور وقیع کام ہے جس کی گرد کو بھی کوئی دوسرا شاعر نہیں پہنچ سکتا۔ جان صاحب کا یہ تخلیقی کام ناقابلِ شکست اور ناقابلِ تسخیر ہے جو انھی کا خاصہ ہے۔ اس میں انھوں نے اُردو شاعری کو ایک نئے موڑ سے آشنا کیا ہے اور ہر ایک مطلع میں ایک پورے فلسفے کو سمو کر آگاہی بخش کام کیا ہے اور دیگر شعرائے اُردو خصوصاً نئی نسل کے شعرا اور نو آموز و تازہ کار شاعروں کو ایک نئی جہت سجھائی ہے۔ مطالع کی اِس صنف پر اتنا کام کیا ہے جو کسی دوسرے شاعر کے بس کی بات نہیں۔ انھوں نے ہر مطلعے کو سجا کر نئے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔

میں یہاں یہ بات پورے وثوق سے لکھ رہا ہوں کہ جان صاحب کی غزلیہ شاعری میں وہ سب کچھ ملتا ہے جو یورپی مفکرین نے شاعری کی تعریف میں کہا ہے اور وہ تمام محاسنِ سخن بھی جان صاحب کی شاعری میں پائے جاتے ہیں جن کا ذکر اُردو کے جید ناقدین نے کیا ہے۔ اُن کی شاعری میں سبھی تعریفوں کا عرق ملتا ہے۔ میں یہاں ان کے اشعار مثال میں پیش نہیں کر رہا کہ مضمون کو طوالت سے بھی بچانا ہے اور اُن کے اشعار کی قرأت اور غزل کی تلاوت کا اصل لطف و سرور اُن کی کتابوں کے مطالعے سے ملے گا۔ میں پاکستان کے صفِ اوّل اور رواں صدی کے نمائندہ شاعر کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اُن کے کام کو قابلِ تحسین سمجھتا ہوں کہ جس سے اُردو ادب کا دامن مالا مال ہوا ہے اور وہ تاریخِ اُردو ادب کا حصہ بھی بنا ہے۔

جان کاشمیری کا کلام پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی نظر شعور اور لاشعور پر بہت گہری ہے۔ اُن کے اشعار کی تشریح و تفسیر کی جائے تو چند الفاظ پر مشتمل نظر آنے والا شعر اپنے اندر معانی و مفاہیم کا ایک بحرِ بےکراں رکھتا ہے۔ اُن کے بعض اشعار میں مکمل فلسفہ سمویا ہُوا ملتا ہے جس کی جتنی پرتیں کھولی جائیں

وہ اُسی قدر تہہ در تہہ کھلتا چلا جاتا ہے اور معانی و مفاہیم کے نئے نئے در وا کرتا ہے۔ شاعرِ موصوف کے کلام میں علمِ نفسیات کے بھی بہت اچھے نمونے ملتے ہیں جو شاعر انسان کی نفسیات اور اُس کے تقاضوں سے واقف ہوتا ہے وہ انسان کے اندر جھانک کر اُس کے دل کا راز پا جاتا ہے اور اُس کے دل کا حال معلوم کر لیتا ہے۔ جان کاشمیری نے بھی اپنے کلام میں انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے اور اُس کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اشعار کو خیالات سے سجایا ہے۔ یہ کام وہی شاعر کر سکتا ہے جو وسیع المطالعہ ہو اور دنیا بھر کا ادبِ عالیہ اُس کے نظروں سے گزرا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جان کاشمیری ایک زیرک اور طباع شاعر ہیں جنھوں نے عہدِ قدیم سے لے کر عہدِ موجود تک کے شعرائے اُردو کا کلام پڑھا ہے اور اُن کے محاسن سے استفادہ کیا ہے۔

جان کاشمیری کو اپنی ذات سے آگاہی بھی ہے، وہ اپنے مزاج کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے، یہاں تک کہ اپنے کلام میں بھی وہ بات نہیں کہتے جو اُن کے مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو، انسان پر ایسے لمحات اور ساعات بھی آتے ہیں جب وہ اپنے روبرو آنے اور اپنی ذات کا سامنا کرنے سے گھبراتا اور کتراتا ہے، جب وہ ایسے حالات و واقعات اور کیفیات سے دو چار ہوتا ہے تو ایسا شخص بے حد حساس ہو جاتا ہے اور اُس کی وہ تمام حساسیت اُس کے فن میں نظر آتی ہے۔ اگر وہ مصور ہے تو اُس کی تصویر کشی اُس بات کی گواہ بن جاتی ہے، او راگر وہ شاعر ہے تو اُس کی شاعری میں یہ عکس بہت نمایاں ہو کر اُبھرتا ہے۔ میری نظر میں یہی فن ہے جو فن کار کے ہنر کی غمازی کرتا ہے۔ اور میرے خیال میں یہی اصل فن ہے اور اُسی فن میں رہنے کو اصل جینے کا ہنر کہا جاتا ہے۔ جینے کو تو سبھی جی لیتے ہیں، مگر حساسیت اور اپنی ذات کی آگاہی کے ساتھ جینا ہی اصل جینا ہے جو انسان کو عزتِ نفس اور خودداری کا احساس دلاتا ہے تو انسان کو اپنی ذات کا عرفان ہوتا ہے اور جو شخص خود کو پہچان جاتا ہے وہ خود سے خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ جان کاشمیری بھی اُسی خود آگاہی سے آشنا ہیں جس کی بنیاد پر وہ جب کسی چیز کی محرومی و مایوسی کے حصار میں گھر جاتے ہیں تو وہ خود کلامی میں خود آگاہی کی باتیں کرتے ہیں - وہ اپنی نامکمل خواہشات اور مفادات کو پورا کرنے کی اُمید میں اپنی اَنا کو بھی زیر کر دیتے ہیں اور جس شاعر میں اَنا کو زیر کرنے کی خوبی ہو، وہ آفاقیت کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جان کاشمیری نے اپنی اَنا کو زیر کر کے اُس پر قابو پا لیا ہے اور اُن کی سوچ کی گہرائی اور فکر کی وسعت اب اُن کے ہر شعر میں نظر آنے لگی ہے۔ میں یہ بات پورے وثوق

سے لکھ رہا ہوں کہ جان کاشمیری کے کلام میں خیال کی ندرت اور تخیل کی بلند پروازی اُن کی اعلیٰ سوچ کی گواہی دیتی ہے اور اُن کو عہدِ حاضر کا منفرد و ممتاز شاعر بناتی ہے اور اُن کو اُن تمام شعرائے اُردو سے ممتاز کرتی ہے جو اُن کے ہم عمر اور ہم عصر ہیں اور یک سانیت کی شاعری کر رہے ہیں۔ اِن تمام شعرائے اُردو میں شاعرِ موصوف کا لہجہ بالکل جدا ہے۔ اُن کا ہنر سب سے منفرد ہے اور انداز سب سے الگ ہے۔ اُسی انفرادیت نے اُن کے کلام میں آفاقیت پیدا کردی ہے جس کی بنا پر ہم اُن کو آفاقی شاعر کہہ سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا محاسن سے اُن کے کلام کی عظمت میں اضافہ ہوا ہے اور اُن کی شاعری کی قدر و قیمت بڑھی ہے۔ اُن کی شاعری میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کسی بھی نکتہ آفریں بات کو سہلِ ممتنع میں ڈھال دیتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں سہلِ ممتنع کی بے شمار عمدہ مثالیں پائی جاتی ہیں۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ جان کاشمیری عصرِ رواں کے اُن شاعروں میں سرِ فہرست ہیں جو سہلِ ممتنع میں کہنے پر مہارت رکھتے ہیں، یہ اُن سب کے سرخیل ہیں۔ میں نے اُن کے ہزاروں ایسے اشعار نشان زد کیے ہیں جو سہلِ ممتنع کی مثالوں میں نہ صرف پیش کیے جاسکتے ہیں بل کہ انھیں نمایاں جہت میں مقابلتاً رکھا بھی جاسکتا ہے، کیوں کہ جان کاشمیری نے سامنے کی بات کو نہایت سہل اور آسان انداز میں بلکہ روزمرہ کی گفتگو کے طور پر منظوم کردیا ہے کہ ایک بڑی تفصیل کو اجمال میں پیش کرنے پر دسترس رکھتے ہیں۔ انھوں نے بشری تقاضوں اور فطرت کے نظام کو بہت عام فہم انداز میں مصور کیا ہے۔ اُن کا تصورِ جمال بڑا حیرت آفریں ہے کہ اس میں سنجیدگی زیادہ ہے۔ یہی سنجیدگی اُن کا تصورِ جمال اور احساسِ حسن کو غور و فکر اور تدبر کی دعوت دیتا ہے اور سوچنے سمجھنے کی طرف بلاتا ہے۔ اُن کے احساسِ جمال میں شعلگی بھی ہے اور تپش بھی، یہ حرارت شعر فہمی کے جسم میں زندگی کی رمق کو متحرک کرتی ہے۔ یہی تحریک اُن کے اشعار میں روح پھونک دیتی ہے اور وہ چلتے پھرتے اور حرکات و سکنات کرتے نظر آتے ہیں۔ اِس تحریک کی بنیاد پر اُن کا کلام زندہ رہنے والا بن گیا ہے اور اُن کے اکثر اشعار سینہ بہ سینہ سفر کر رہے ہیں۔ میں یہ بات ثابت بھی کرسکتا ہوں کہ جان کاشمیری کا نام اِس صدی کے نمائندہ شعرائے اُردو میں لکھا جائے گا اور ہوسکتا ہے کہ یہ رواں صدی اُن ہی کے نام ہو جائے کیوں کہ وہ ابھی بہ قیدِ حیات ہیں اور اُن کی شاعری کا سفر مسلسل ارتقائی مراحل سے گزر رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

شہاب فکر ___ رانا محمد شاہد

شہاب فکر رانا محمد شاہد کے کالمز اور مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے پر ڈاکٹر طاہر مسعود، احمد حاطب صدیقی، افضل پارس، شبیر ابن عادل نے اظہار خیال کیا ہے یہ اظہارات کتاب کے مطالعہ کا شوق بڑھاتے ہیں۔

رانا محمد شاہد، اپنی بات، میں لکھتے ہیں:

،ایسے بہت سے شاعر و ادیب آپ کو ملیں گے جو یہ کہتے ہیں کہ انھیں اپنے لکھے کی ستائش نہیں چاہیے نہ جانے وہ ایسا کیوں کہتے ہیں میرے خیال میں لکھنے والے کو ستائش ہی تو چاہیے ہوتی ہے،

میں رانا صاحب کی اس رائے کی تائید کرتی ہوں تحریر کا مطالعہ اور تبصرہ نیز تحسین لکھنے والے کی حوصلہ افزائی ہے اور اعتماد پیدا کرتی ہے مسرت بخشتی ہے۔

رانا محمد شاہد نے ڈائجسٹ تحریروں اور خواتین، کے میگزینز کو بھی مثبت انداز میں سراہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عمدہ کام کہیں بھی ہوسکتا ہے اور ہو رہا ہے ادبی جریدہ یا ڈائجسٹ دونوں پر یہ بات لاگو ہوتی ہے۔

ادیب بنیادی طور پر حساس ہوتا ہے کسی مدیر کا متکبرانہ رویہ کسی نام نہاد نقاد کی جانب دارانہ تنقید یا ایک فقرہ ادیب کی زندگی کا ایک دن (بعض اوقات اس سے بھی

دردانہ نوشین خان

زیادہ) بوجھل کر دیتا ہے
کالم "انصاف یہ ہوتا ہے" جی دار تحریر ہے کالم نگار کو اسی طرح حق گو ہونا چاہیے۔
کالم "کم جوان دی موت ہے" رانا محمد شاہد کی وطن کے ساتھ مخلصانہ محبت پر مبنی درد انگیز تحریر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان کے بعد بننے والا بنگلہ دیش پاکستان سے زیادہ ترقی کر گیا اس لیے کہ "شیخ حسینہ واجد نے جواب دیا" ہم نے مولوی کو مسجد میں فوج کو بیرکوں تک اور سپورٹس مین کو گراؤنڈ تک محدود رکھا"
رانا محمد شاہد نے بچپن کی سچی اور بے ریا عید اور بچپن کی سحری اور افطاری کے کالم بھی خوب لکھے ہیں سچے مشاہدے اور سادہ اسلوب نے ان کو رنگین بنا دیا ہے۔
رانا محمد شاہد کے مضامین میں جہاں روزمرہ زندگی کی جھلکیاں ہیں وہاں اہم ٹی وی ڈراموں اور فلموں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے سنجیدہ تاریخی حقائق کو خون جگر میں انگلیاں ڈبو کے رقم طراز کیا ہے مثلاً سانحہ جلیانوالہ باغ اور ہندوستانیوں کی تذلیل۔۔ ایسے مضامین شاہد صاحب کے تاریخ کے مطالعے اور ریسرچ کی نشاندہی کرتے ہیں۔
"بچپن کا رومانس۔۔ نیلام گھر" ذہن میں کئی یادیں اُجاگر کر گیا۔ طارق عزیز کی گونج دار آواز گلی محلے سے گزرتے ہوئے روشن دانوں سے باہر آتی سنائی دیتی تھی نیلام گھر بہت عرصہ چلا تھا اور اس کی مقبولیت میں کمی نہیں ہوتی تھی لیکن جیسا کہ رانا محمد شاہد نے لکھا کہ 30 سال قبل دکھایا جانے والا گیسٹ ہاؤس اب دیکھ کر ہنسی نہیں آتی اب ان کے بچوں کو ہنسی آتی ہے۔ تو اصل رمز یہی ہے کہ زمان و مکاں نہیں بدلتا انسان بدلتا ہے۔
"موت اور انسانی بے بسی" اور "سیرت مبارکہ اور شانِ مصطفیٰ" رانا محمد شاہد کی حب رسولؐ اور پختہ ایمان کی نشانیاں ہیں۔
"ایک ہاتھ میں ایٹم بم دوسرے میں کاسہ گدائی" اور "آٹے کے لیے ذلیل ہوتی عوام اور بے حس حکمران سیاسی کالم ہیں اور سیاست پاکستان کے عوام کے لیے کانٹوں کا تاج جبکہ سیاست دانوں کے لیے نسخہ راج ہے۔
رانا محمد شاہد کا قلم زندگی کے ہر شعبے کے ہر پہلو سماجی تہذیبی معاشرتی تاریخی اور سیاسی کو یکساں طور پر اجاگر کرتا ہے موضوعات حیات بے حد ہیں اور دعا ہے کہ رانا محمد شاہد کا قلم رواں دواں رہے۔

☆☆☆☆☆

"یادِ رفتگاں"

گزشتہ روز لندن میں مقیم جہلم کے خوب صورت شاعر برادرم سلیم فگار نے ادبی فورم جہلم کے آفیشل گروپ میں ایک نایاب ویڈیو کلپ شیئر کی تھی، جس میں اردو کے شہرۂ آفاق شاعر جناب اقبال کوثر (مرحوم) غزل سرا ہیں جب کہ پروفیسر امین طرب صدیقی، پروفیسر یوسف حسن، جمیل افضل اور راقم (سکندر بیگ) بھرپور داد سے نواز رہے ہیں طرب احمد صدیقی کی رہائش گاہ کالا گوجراں کے وارا محلّہ میں تھی صدیقی صاحب بہت عمدہ شاعر انتہائی ملنسار اور شاخسار آدمی تھے شہر کے لوگ ان کی شرافت اور انسان دوستی کی وجہ سے ہمیشہ انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اقبال کوثر، یوسف حسن اور طرب احمد صدیقی تینوں ہم عصر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ گہرے دوست بھی تھے وہ ہر چھوٹی بڑی عید کے موقع پر پروفیسر طرب احمد صدیقی کے دولت کدے پر عید کا تہوار باہم مل کر مناتے پروفیسر یوسف حسن راولپنڈی سے اپنے آبائی قصبے کالا گوجراں میں تشریف لے آتے نمازِ عید کی ادائیگی کے بعد اقبال کوثر صاحب کی ہمراہی میں امین صاحب کے گھر کا رُخ کرتے جہاں اہلِ خانہ نے مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے پیشگی اہتمام کر رکھا ہوتا تھا دونوں صاحبان کے تشریف لاتے ہی فون پر عید مبارک کے پیغامات وصول کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ یوسف حسن بعض دوستوں کو خود فون کر کے عید مبارک کہتے میری پوسٹنگ ان دنوں بطور ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس آفیسر ضلع اوکاڑہ میں تھی عید کا تہوار اپنی فیملی کے ساتھ منانے کے لیے مجھے اپنے آبائی گاؤں اور جہلم شہر آنا پڑتا تھا یوسف حسن اکثر بارہ بجے کے بعد مجھے فون کر کے پوچھتے کہاں ہو پھر ساتھ ہی حکم صادر کرتے کہ امین صاحب کے گھر آ جائیں اور میں بادل نخواستہ گھر سے نکل پڑتا جب کہ میری بیوی کہتی کہ آپ عید والے دن بھی بچوں کو وقت نہیں دیتے مگر

مرزا سکندر بیگ

میں سنی ان سنی کر دیتا ویسے بھی کالا گوجراں سے میری محبت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے میرا بچپن اور شباب سکول اور کالج کے دوستوں کے ہمراہ اس شہر کے گلی کوچوں کی خاک چھانتے گزرا ہے ڈاکٹر خاور السلام اطہر شاہ تسود شاہ (مرحوم) سید طاہر شاہ گیلانی (مرحوم) طارق چوہدری ڈاکٹر ذوالفقار درانی راو سلیم اور واجد چوہدری جیسے دوستوں کی بے لوث محبتیں آج بھی میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں امین صاحب کے گھر پر عید ملن کی دعوت کے بہانے اور عید بقر پر تینوں محترم احباب کو گوشت تقسیم کرنے کا کہہ کر میں کالا گوجراں پہنچ جایا کرتا تھا تینوں معزز ہستیوں کا شمار نہ صرف اپنے شہر بلکہ ادبی دنیا میں جانی پہچانی شخصیات کے طور پر ہوتا تھا غزل اور نظم کے حوالے سے اقبال کوثر صاحب کا اسم گرامی صف اول کے شعرا میں شامل تھا جو اردو ادب کے افق پر درخشاں ستارے کی طرح ہمیشہ جگمگاتا رہے گا مجھ سمیت بے شمار شعرا نے ان سے کسب فیض کیا ہے اسی طرح پروفیسر یوسف حسن بحیثیت شاعر اور تنقید نگار اردو ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں پروفیسر امین طرب صدیقی اردو اور پنجابی کے عمدہ شاعر تھے انھوں نے پرائمری سکول ٹیچر کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا سیلف میڈ آدمی تھے اپنی

محنت لگن اور ذاتی کوششوں کے نتیجے میں پروفیسری کے مرتبے پر فائز ہوئے جی ٹی روڈ کالج جہلم میں میرے اردو کے استاد تھے اپنی عمدہ شخصیت اور بے پناہ خوبیوں کے باعث کالج میں طلبہ کے پسندیدہ ٹیچر سمجھے جاتے تھے ان تینوں نابغۂ روزگار شخصیات کی رفاقت میں بہت یادگار دن گزرتا ان کی بے لوث محبت اور شخصیت کا اعجاز تھا کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا پروفیسر صاحب کا اکلوتا بیٹا فیصل امین (مرحوم) وقفے وقفے سے اشیائے خورونوش لاتا جن میں فروٹ چاٹ کھیر مرغ پلاو بھنا ہوا گوشت اور خالص دودھ پتی شامل ہوتی یوسف حسن شدید کھانسی کے باوجود مسلسل سگریٹ نوشی کرتے رہتے جبکہ میں بھی قدم سے قدم ملا کر ان کا بھرپور ساتھ دینے کی کوشش کرتا جس کا خمیازہ میں اب بھگت رہا ہوں اس طویل دورانیے کی نشست میں ادیبوں شاعروں اور رفتگاں کا محبت آمیز تذکرہ ہوتا ملک میں ہونے والی ادبی سیاسی اور معاشی سرگرمیوں کے حوالے سے گفتگو ہوتی سوشلزم اور مارکسزم یوسف حسن صاحب کا پسندیدہ موضوع ہوتا تھا وہ اکثر کہتے کہ کارل مارکس نے دنیا بھر کے محنت کشوں کو پیغام دیا تھا کہ وہ متحد ہو جائیں اس عمل میں انھیں غلامی کی زنجیروں کے سوا کچھ نہیں

کھونا، ان کی شاعری بھی ان کے انقلابی نظریئے کی ترجمان ہے:

رہ گیا جانے کہاں قافلہ قندیلوں کا
رات انبار اٹھا لائی ہے تاویلوں کا

ہاتھ رہ رہ کے دعاؤں کے لیے اٹھتے تھے
آسماں پر تھا نشاں تک نہ ابابیلوں کا

....

ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

اِک بے اَنت سمندر تیری منزل اے دریا
لیکن خاک اڑائیں تیرے ساحل اے دریا
ہم بھی پربت کاٹتے ہیں اور مٹی چاٹتے ہیں
ہم بھی تیرے کنبے میں ہیں شامل اے دریا

....

اسی طرح کوثر صاحب کے سینکڑوں اشعار آج بھی زبان زدعام ہیں:

جس طرح لوگ خسارے میں بہت سوچتے ہیں
آج کل ہم تیرے بارے میں بہت سوچتے ہیں

جو تصویر بنائی میں نے آپ اُدھوری رکھی ہے
جتنی قربت قدر نہ کھودے اتنی دوری رکھی ہے

مجھے تو گھر کے اندھیروں نے بانٹ رکھا ہے
میں اک چراغ کئی طاقچوں میں جلتا ہوں

....

کالا گوجراں سے تعلق رکھنے والے نوجوان شعرا جن میں اعجاز روشن محمود پاشا جمیل افضل سعید میر پروفیسر مسعود احمد سعید بیتاب بشارت الٰہی عرفان عرفی اور بسا اوقات غافر شہزاد بھی شریک محفل ہو جایا کرتے تھے اختتامی دور شاعری کے لیے مختص ہوا کرتا تھا حاضر شعرا اپنا اپنا کلام مرحمت فرماتے اشعار سناتے ہوئے امین طرب صدیقی کی آنکھیں اشکبار ہو جایا کرتی تھیں مجھے حیرت زدہ دیکھ کر یوسف صاحب نے سرگوشی کرتے ہوئے بتایا کہ ”جب سے ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا ہے وہ اپنے اشعار پڑھتے ہوئے اکثر رو پڑتے ہیں، یوں تھوڑی دیر کے لیے ماحول پر افسردگی چھا جاتی بالعموم شام کی اذان سے ذرا پہلے سب دوستوں کی خواہش پر یہ منفرد اور یادگار عید ملن محفل اختتام پذیر ہو جاتی پروفیسر امین صاحب اقبال کوثر صاحب اور یوسف حسن صاحب کے دم قدم سے شہر میں رونقیں تھیں تینوں دوست یکے بعد دیگرے راہی ملک عدم ہو گئے یوں مظلوم ہم وطنوں کے حق میں اٹھنے والی یہ آوازیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئیں مگر شعروں کی صورت میں ان کی گونج ہمیشہ کانوں میں گونجتی رہے گی دعا ہے اللہ کریم (مرحومین) کی ارواح کو جنت الفردوس میں بلند مرتبہ عطا فرمائے ۔ آمین ثم آمین

لد گئے اوہ یار پیارے سخن شناس ہمارے
سخن صراف محمد بخشا لعلاں دے بنجارے

☆☆☆☆☆

شہزاد نیرّ ____ "گرہ کھلنے تک" کا تنقیدی جائزہ

قیام پاکستان سے لے کر اب تک اردو نظم کی شکل و صورت، انداز بیان، زبان، موضوع اور دوسری تبدیلیوں میں میرا جی اور ن م راشد کی قائم کردہ روایات کو زیادہ دخل رہا ہے

جدید سے جدید شاعر میرا جی اور ن م راشد کے شعری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

موجودہ دور میں زیادہ تر شعرا طبقہ آزاد نظم سے علاقہ رکھتا نظر آتا ہے۔

نظم جو اپنے نام سے ظاہر ہے یک موضوعی نظم صرف کسی ایک موضوع پر خیالات یا جذبات کے اظہار کا نام نہیں بل کہ خیال میں ابتدا ارتقا اور انتہا بھی ہونی چاہئے۔

اردو نظم کو بے پناہ وسعت حاصل ہے۔ اس میں حسن و عشق کے جذبات سے لے کر تمام معاشرتی مسائل کو بھی فنی رچاؤ کی خوب صورتی سے سمویا جا سکتا ہے

یہ کام ابتدا سے جاری ہے۔ آج جو نظم کہی جا رہی ہے وہ ایک بھرپور نظم ہے جس میں نتائج اخذ کرنے کی پانچوں سطحیں بروئے کار لائی گئی ہیں۔

زیر موضوع جناب شہزاد نیر کی کتاب "گرہ کھلنے تک" ہے جو میرا پسندیدہ نظم گو ہے۔ اس کتاب میں اس نے جو نظمیہ رویہ اختیار کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی نظمیں کثافت سے عاری اور لطافت سے مالا مال ہیں۔

وہ انتہائی حساس شاعر ہے۔ جب اس حساسیت انتہا کو پہنچتی ہے تو: ساختیات، ہدایت کار، کفن چور، ویلنٹائن ڈے اور اس جیسی کئی بہترین نظمیں اس عمدگی کے ساتھ لفظوں کے پیرائے میں ڈھال کر قاری کے آگے رکھ دیتا ہے کہ وہ اس کی سحر گری سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انسانی کردار کو صرف لفظ "کٹ" یعنی موت یا امر الٰہی تک محدود کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

وریداللہ ورید

ڈرامہ کر دکھاؤ کٹ

(ہدایت کار)

وہ وقت سے سوال اس طرح کرتا ہے۔
جوابات خود بخود ابھرتے ہوئے نظر
آتے ہیں
وقت کے گہرے سناٹے سے
تند سوال کا اک کنکر ٹکرا جائے تو
لاکھ جواب ابھر آتے ہیں

....

وہ تجسسات کی گھمبیر لہر میں بہتا ہوا محسوس
ہوتا ہے۔ اسے کسی کی تلاش ہے اور یہ تلاش
انسان سے خدا کی بھی ہو سکتی ہے۔ کچھ سمجھ
میں نہیں آتا یہ تلاش آخر کس چیز کی ہے جو وہ یہ
کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ:

یہ عجب منطقے ہیں کہ ان پر
کوئی حرف لکھنے لگیں تو سخن ڈولتا ہے
قلم کا قدم راستہ چھوڑتا ہے

اے تلاش حسین حسن پردہ نشیں
تیرے لفظوں کی تعبیر سے
تیرے لہجے کی تفہیم تک
تیری آنکھوں کی تفسیر سے
تیرے خوابوں کی تجسیم تک
کچھ بھی کھلتا نہیں
کچھ بھی کھلتا نہیں ہے

مگر تیرا بندِ قبا ہو کہ ہستی کا عقدہ
تجسس گرہ کھولتا ہے
تجسس بہت بولتا ہے

تیرے آب گم کی تلاش پر
میری زندگی کی اساس ہے

"کفن چور" پڑھتے ہوئے میرے آنسو بہہ
نکلے اور میں بھی نیر جی کے ساتھ شامل دعا ہوا

پردہ خاک میں لپٹے ہوئے بے جان وجود
باعث ننگ زمیں ہوں مگر اک بات بتا
جسم مٹی ہو تو کپڑوں کی ضرورت کیا ہے

دیکھ پیوند زمیں میرے تن عریاں پہ
داغ افلاس کا پیوند اجازت دے دے
مر کے مرتے ہوئے انسان کو زندہ کر دے
اک ملبوس کمانے کی اجازت دے دے
ورنہ بھوکی ہے بہت خاک کہاں دیکھے گی
جسم کھا جائے گی پوشاک کہاں دیکھے گی

....

وہ خود سے باتیں کرتا ہے۔ اس کا خود کو ہر بلاوا
آخری ہوتا ہے کیونکہ وہ وقت کے نہ مڑ کر آنے
کا قائل ہے
میرے خواب تھے اور تم؟

تم حقیقت میں کھوئے ہوئے بھول بیٹھے
کہ دنیا کے جنگل میں خوابوں کی سمتیں تو کیا
لوگ آنکھیں بھی کھو بیٹھتے ہیں
تمہاری کئی سال کی بیرخی
سے میں کمزور ہوں اور تم
آج بھی تیز رفتار ہو
دیکھو لحظہ بہ لحظہ تمھارے قدم کی
یوں ہی دور ہوتی ہوئی چاپ سنتا رہا
تو میں چپ چاپ مر جاؤں گا
اور تم کو خبر بھی نہ ہوگی

....

ویلنٹائن ڈے پڑھتے ہوئے ذہن میں منیر
نیازی کی کینیڈین دوشیزہ سے نظر نظر میں ملاقات
کا منظر گھومتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے ایک دوشیزہ
جو خود پھولوں کی مہک لیے ہوئے ہے ایک
پھولوں کی ریڑھی لگائے بیٹھی ہے۔ شاعر سوچتا
ہے پھول کو پھولوں کے بیوپاری کیا ضرورت؟
مگر پیٹ......
کتنا چاہا ہے کہ میں پھول خریدوں تجھ سے

اور پھر پیار سے تجھ کو ہی تھمادوں لیکن
آخری پھول کی مہکار تیرے ہاتھوں سے
آج کی شام کا بازار میرے ہاتھوں سے
دھوپ کے ساتھ کہیں اور پھسل جائیں گے
مفلسی ایک طرح وار کیا کرتی ہے

ایک بار پھر شہزاد نیر تجسس میں ہے۔ آخر یہ کیسا تجسس ہے،
اب کی بار پہلے والا تجسس نہیں۔ یہاں آگے بڑھنے کا تجسس
ہے۔ سوچنے کا تجسس ہے۔ کھلنے کا تجسس

لگاتار چلنے دے اور آگے بڑھنے دے
سوچوں کے پردے اترنے دے
اب دھیرے دھیرے مجھے کھول
آہستہ آہستہ خود مجھ پہ کھل
جب تلک اک تجسس رہے گا
تعلق رہے گا
کیا واقعی جگ بیوپاری ہے۔ ہاں اک صدا
وردل سے وا ہوتی ہے پھر وہ کہتا
آپ سیتوں نگ پگ چھالے، آپ سنبھالوں نیر
کون چنے میرے برادو کانٹے کون سے میری پیڑ
اس کے ہاں اداسی کی بہت سی پرتیں ہیں۔ یہ
انتہائی خوش آئند دریافت ہے

اداسی جاگتی ہے سو نہیں سکتی
اداسی کاٹتی ہے کٹ نہیں پاتی
دلوں میں بانٹتی ہے خود کو لیکن بٹ نہیں پاتی
کہنے کو بہت کچھ ہے مگر میری وسعت افلاک
جتنی نہیں
نوحہ گر کہانی پھر کبھی
شہزاد نیر صاحب کے لئے بہت دعائیں۔

☆☆☆☆☆

شاہدہ دلاور شاہ کا دوسرا ناول ''سمے کا ساحل''

ناول ایک نثری صنف ادب ہے جو قصہ گوئی کے لیے مخصوص ہے اس لیے اس کی بے شمار اصطلاحی تعریفیں ملتی ہیں۔ مختلف زبان وادب کے فنکاروں اور نقادوں نے اپنے اپنے طور پر ناول کے متعلق مختلف نظریات وخیالات کا اظہار کیا ہے اور اپنے آئینہ خیال اور پیمانہ افکار کے نتائج کے طور پر ناول کی تعریفیں بھی کی ہیں۔

لفظ ''ناول'' اطالوی زبان کا لفظ ''ناویلا'' سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں نیا، عجیب یا انوکھا کے ہیں۔ کلارا ریوز کے مطابق:

''ناول اس زمانے کی زندگی اور معاشرت کی سچی تصویر ہے جس زمانے میں وہ لکھا جائے''۔

اچھی اور سچی تحریر اپنے اندر ایک مکمل کشش رکھتی ہے ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ کا دوسرا ناول ''سمے کا ساحل'' جدید ناول کی تعریف پر مکمل اُترتا دکھائی دیتا ہے۔ سرقے اور گوگل کے مجموعی دور میں اگر کوئی جینوئن تحریر میسر ہو تو غنیمت ہے۔ سمے کا ساحل اپنے عنوان کی طرح مختلف نوعیت کا ناول ہے۔ ناول کے مختلف کردار مکمل طور پر آزاد نظر آتے ہیں اور کسی ایک کردار پر بھی ناول نگار کا شائبہ ہونا ناممکن ہے۔

ناول کے متن سے ناول نگار کی مہارت اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کیسی خوش اسلوبی

طلحہ غفور

سے اپنے اردگرد پھیلی کہانیوں کو ایک ترتیب سے جوڑا ہے کہ کہیں بھی تسلسل خراب نہ ہو۔ قاری جب ان تمام بکھری کہانیوں کو جوڑتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ تمام کردار مختلف رہ کر بھی صف بہ صف ہیں۔ قاری کو مصنف کے ساتھ چلانا ہی مشکل اور لازم امر ہے اچھا لکھاری ہمیشہ تیسری آنکھ سے چیزوں کو دیکھتا ہے اور چھٹی حس سے محسوس کرتا ہے میرے نزدیک اگر ڈاکٹر صاحب کو پیشے کے لحاظ سے نہ بھی جانا جائے تو بھی اس ناول کو کو پڑھنے کے بعد کوئی بھی قاری یہی رائے قائم کرے گا کہ مصنف معاشرے کا نباض اور مدرس ہے جو کہ اس ناول کے مکالے کی ایک منفرد خوب صورتی ہے۔ میرے خیال سے جب کوئی استاد کسی طالب علم کو پڑھاتا ہے ہے تو وہ خود بھی اس طالب کو پڑھ رہا ہوتا ہے اس طرح وہ مختلف عمروں مزاجوں اور رویوں کے نہ صرف لوگوں کو پڑھتا ہے بلکہ اتنے ہی خاندانوں کو جانچتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا علمی اور فنی سفر ایسے ہی بے شمار کہانیوں پر محیط ہے جو ان کے قلم کے ذریعے اچھوتی اور نایاب تحریریں قرار پاتی رہیں گیں۔ بطور طالب علم ڈاکٹر صاحب کو اس ناول پر ڈھیروں مبارکباد پیش کرتا ہوں بلاشبہ انہوں نے شاعری اور کالم نگاری کی طرح ناول نگاری میں بھی عمدہ اور بہترین کام کیا ہے آخر میں ناول سے چند سطور حاضرِ خدمت ہیں:

”دھوپ کے رنگوں میں کھو جانے کی خواہش کسی تیز دھوپ کی سمت لے جاتی ہے۔“

”کھڑکیوں پر جمی ہوئی راکھ بتاتی ہے کہ وہ کس چراغ کے دھوئیں کے طفیل یہاں آ چپکی ہے۔“

”قرضے بڑھانے کے بجائے پیڑ کی پرورش ضروری ہے کیوں کہ پیڑ بوڑھا بھی ہو جائے تو بھی مہنگا بکتا ہے۔“

”نفرت صاحبِ اولاد ہوتی ہے اور اس کی افزائش مچھروں، مکھیوں اور متعدد امراض کی نسبت زیادہ تیزی سے پھیلتی ہے۔“

”میرے اختیار میں آج کا آدمی آیا ہوا ہے تو کیوں نہ اس کو کھاؤں اور اپنی مرضی سے کھاؤں کیوں کہ آنے والے کل کے آدمی نے مجھے کھا جانا ہے۔“

”یہ تم جو کہتے ہو کہ شامیں کٹتی نہیں سال گزر جاتے ہیں، میں ان کو نہیں مانتا۔ نہ شامیں اپنی جگہ چھوڑتی ہیں نہ سال۔ یہ ماہ و سال اور صدیاں کوئی چیز نہیں ہوتیں۔ یہ دنیا انسانوں کے آنے جانے پر محیط ہے ایک آتا ہے تو دوسرا جاتا ہے وقت سفر میں نہیں بلکہ انسان سفر میں ہے۔“

☆☆☆☆☆☆

پنجاب کے گمشدہ کردار: مائی مکی

مائی مکی، مکی اور چنے بھوننے والی بھٹھیارن اور تندور بھی لگاتی ہے۔ صبح سے شام تک مین روڈ سے کچھ فاصلے پر ایک مسجد کے ساتھ خالی پلاٹ میں بنائے گئے اپنے تندور اور بھٹی کے لیے گھاس پھوس خشک پتے اور لوگوں سے مانگے تانگے کی لکڑیاں اور گتہ کاغذ جمع کرتی ہے اور تندور اور بھٹی کو ہر دم روشن رکھتی۔ روشن تندور اور بھٹی کو آندھی بارش سے بچانے کے لیے اس نے باقاعدہ اینٹوں کے چار ستون بنا کر اس پر ٹیڑھی مڑھی لکڑیاں کچھ لکڑی کے بالے ڈال کر اور ایک چھت بھی بنائی ہے، اور چاروں کونوں میں خود کھڑی ہو کر اندازہ کرتی رہی کے چھپر کی چھت اتنی اُونچی ہو کے لمبے بندے کا سر نہ ٹکرائے اس چھپر سے کچھ فاصلے پر اندر کی طرف رسیاں باندھ کر ان پر پرانی چادریں پلاسٹک شیٹ گتے اور رنگ برنگے کپڑوں سے ایک دیوار بنائی گئی ہے اس دیوار کے پیچھے ہی مائی مکی کی رہائش ہے۔ رہائش گاہ سے نکلنے والے ہر شخص کو لوگ مائی مکی کا بندہ کہتے ہیں، مگر مائی مکی کبھی بھی کسی کی اصلاح نہیں کرتی، بس خاموش بیٹھی تکتی رہتی ہے یا پھر چلتے پھرتے کہہ دیتی کہ چاوڑ پراں...... کڑا بندہ تے کڑی بندی کوئی کسے دا سہارا نئیں، مائی مکی کے پلاٹ پر سارا دن رش رہتا ہے کوئی مکی لینے آتا ہے تو کئی روٹیاں خریدنے اور کوئی تشلا اُٹھائے روٹیاں لگوانے آتا ہے مائی مکی دو طرفہ آگ میں جلتی ہے مگر کسی سے بدتمیزی نہیں کرتی۔

خواتین سے تو خاص طور پر شائستہ لہجے میں گفتگو کرتی ہے وہ جتنی روانی سے پنجابی بولتی ہے اتنی ہی سہولت سے اُردو بھی بولتی ہے خواتین اس کی جسمانی ساخت خدوخال، گفتگو چال ڈھال اور قد بت کے ساتھ آنکھوں کے سرمے اور مسی کی ان کی چمک سے بھی پریشان رہتی ہیں۔ مگر نوجوان بچے اور مرد حضرات مائی مکی سے ہمیشہ خوش رہتے

اعجاز رضوی

ہیں مائی مکی کی عمر تیس سال کے قریب ہے اس کا قد لمبا کمر پتلی اور شانے چوڑے ہیں خدوخال میں غربت اور خوبصورتی دونوں کی جھلک نمایاں ہے اور اس کو یہ بات معلوم ہے اس لیے منت کی سرخ نیلی پتلی ڈوریاں اس کے ہاتھ پر نظر آتی ہیں۔

وہ شہر میں رہتے ہوئے بھی پنجاب کا روایتی لباس دھوتی کرتا ہی پہنتی ہے اور اپنے چست کُرتے کے سامنے والے بٹن کی جگہ ہک لگاتی ہے اور جس ہک سے حاکمیت شروع ہوتی ہے وہاں کے ایک دو ہک کھول کر رکھتی ہے اس طرح جہاں اس کو دائیں بائیں کھجلی کرنے میں آسانی ہوتی ہے وہاں لوگوں کی نظر بھی خراب مکی سے ہٹی رہتی ہے۔

مائی مکی کا رنگ سنہرا ہے جو بھٹی پر دانے بھونتے ہوئے تندور پر روٹیاں لگاتے ہوئے آگ کی تپش سے اور بھی سرخی مائل سنہرا ہو جاتا ہے اور خاص طور پر اس کے گال تو یوں سرخ ہو جاتے ہیں کہ باخواہش ان کو چھونے کو دل کرتا ہے مائی بھٹی پر ہو یا تندور پر ہمیشہ آلتی پالتی مار کر بیٹھتی ہے اور دھوتی کے دونوں پلو ملا کر دونوں ٹانگوں کے بیچ کس کر رکھتی ہے وہ تندور سے روٹیاں نکالتے ہوئے لوہے کی باریک سلاخوں کو ایک دوسرے پر یوں رگڑتی ہے کہ سامنے والا فوراً متوجہ ہو جاتا اور مائی تندور میں جھانکتی ہے، گردن گھما کر تندور میں لگی روٹیوں کو پہچانتی ہے پھر سلاخوں سے روٹی پکڑ کر باہر رکھ دیتی ہے اور سامنے والا روٹی کے ساتھ اپنا دل بھی پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔

مائی کی گدی جس پر بیٹھ کر وہ تندور اور بھٹی کو چلاتی ہے دو تین بوریوں کو جوڑ کر بنائی گئی ہے یہ گدی تندور اور بھٹی سے کچھ اونچی ہے اس کے ایک کونے میں مائی مکی روپے رکھتی ہے تو ایک کونے میں ریزگاری، ریزگاری کو مائی مکی ذخیرہ کہتی ہے مائی کا کاروبار سردیوں میں جب کچھ مندا ہو جاتا ہے تب یہ اپنے چھپر کے قریب ہی پڑی ہوئی ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر کچھ پھل اور سبزیاں لگا لیتی ہے مگر گرمیوں میں اس کو روٹیاں لگانے اور بھٹی پر دانے بھوننے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔

شدید گرمی میں جب لوگ آٹا رکھ کر تندور کی گرمی سے بچنے کے لیے دور ہوتے ہیں تو مائی مکی آٹا اپنے قریب کرتے ہوئے کہتی ہے، بڑی گرمی لگدی اے، آٹا رکھ کے دور ہو گیاں ایں، ماما یاد رکھ، اے میری پکائی اگ اے، تے رب دی پکائی کیسی ہووے گی، پھر وہ آٹے کے پیڑے بنانے میں مصروف ہو جاتی ہے کبھی کسی تھیلے میں پیڑے بنے ہوئے ہوں تو مائی پیڑا ہتھیلے پر ڈالتی ہے اور خشکا لگا کر پیڑا ہاتھ میں پکڑتی ہے اور خوش ہو کر کہتی ہے گولائی تے ٹھیک اے پر نرمائی کچھ زیادہ وے، اب اگر آٹا لانے والا پختہ عمر کا ہوتا تو ہنس کر ٹال دیتا، اور اگر بچہ ہوتا تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مائی کو تکتا تو مائی کہتی وڈا ہو جا، سب پتہ

لگ جائے گا۔ یوں وہ بات مکمل کرنے کے بعد پھر روٹیاں گنتی ہے اور پیسے وصول کرتی ہے ایک زمانہ تھا جب ایک روپے میں سولہ آنے ہوتے تھے اور صرف آٹھ آنے پر ہی سودا پورا ہو جاتا تھا کہیں دو چار آنے کی مزید ضرورت پڑتی تو لوگ جیبوں میں یوں ہاتھ مارتے جیسے پیسے گم ہو گئے ہوں۔ اس صورت میں مائی کہتی جھتے اصل مال اے اوتھے ہتھ مار، گاہک پیسے دینے میں دیر کرتا تو مائی پھر مخاطب ہوتی ہا ہائے جتھے اصل مال اے اتھے ہتھ مار اگر کوئی گاہک پیسے دینے میں مزید دیر کرتا تو مائی کہتی زیادہ دیر کھڑے ہون دے پیسے وکھرے ہون گے۔ چل جلدی کر جلدی، فیر گلا نہ کریں کہ گھر بیٹھی بڈھی ناراض ہوندی اے اگر سامنے کوئی برقعہ پوش خاتون ہوتی تو وہ مخاطب ہوتی بیگم جی فرمائیں اور کیا خدمت کروں خاتون گھبرا کر کہتی نہیں نہیں، بس ٹھیک ہے روٹیاں لگا دو اور بچے کے لیے مٹھی مکئی بھی، مائی کہتی صرف یہ ہی تو دو کام کرتی ہوں آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں پھر ہنستے ہوئے کہتی لیں جی نقاب پوش بی بی صاحبہ یہ لیں روٹیاں اور یہ ہے چھلی پھر پیسے وصول کرتی اور نئی روٹی لگانے کے لیے گھاس پھوس پر گول کپڑا چھڑا کر بنائے گئے بوجے پر ہاتھ پھیرتی پھر کچھ خشک محسوس ہونے پر پاس ہی رکھی پکی مٹی کی سرخ کنالی سے اپنے سیدھے ہاتھ کا پنجا تر کرتی اور بوجے پر پھیر کر روٹی بوجے پر رکھتی اور تندور میں لگا دیتی، اور فوراً ہی سلاخوں کے ساتھ ایک روٹی تندور سے نکال لیتی، روٹی لگانے اور پکی ہوئی روٹی کو نکالنے میں مائی مکئی کی مہارت دیکھ کر اکثر لوگ حیران ہوتے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر اظہار بھی کرتے مگر منہ سے کچھ نہ بولتے کے سب کو پتہ تھا کہ اگر کوئی فقرہ مائی مکئی کو ناگوار گزر گیا تو یہ گرم گرم تندور والی سلاخ ہاتھ پر لگا دے گی اور ساتھ ہی حکم بھی جاری کر دے گی کہ ہن تسی ایتھے نہیں آنا اپنی نقاب پوش بڈھی نوں بیجو میں اس نوں دساں کے گل کس طرح کری دی اے مائی مکئی کے بارے میں لوگوں کا علم کتنا تھا اس کا اظہار کوئی نہیں کرتا تھا۔

مگر خود مائی مکئی نے جو اپنے بارے میں کہا ہے وہ سب کو اچھی طرح یاد ہے اور سب لوگ اسی کا حوالے دیتے ہیں سب جانتے تھے کہ مائی مکئی کا اصل نام مہر النسا ہے اور وہ چنگڑ قبیلے سے تعلق رکھتی ہے اور خود کہتی ہے کہ ملتان میں ہم لوگوں کو چھنگڑ کہا جاتا ہے ادما ساڈے وڈ وڈیرے جموں کے پہاڑوں سے اُتر کر آئے تھے۔ کچھ سیالکوٹ میں رہ گئے کچھ وڈے شہروں کے آلے دوالے جمع ہو گئے ہم لوگ زرعی مزدوری کرنے والے لوگ ہیں اور ہماری عورتیں چنا گندم باجرہ مکئی اور چاول کے بیوپاریوں کے لیے غلہ چھاننے اور صاف کرنے کا کام کرتی تھیں۔ اسی لیے میں بھی چنا مکئی کی ہو بیٹھی مائی مکئی کا کہنا ہے کہ میں تو اللہ واسطے ہی بھٹیارن بن گئی۔ فیر

روٹیاں لگانے لگی اللہ جانے میرے باقی لوگ کہاں گئے، وہ مجھے چھوڑ گئے یا میں اُن سے بچھڑ گئی یہ سب کچھ تو سوہنے رب کو ہی پتہ ہے۔ پر مجھے اتنا یاد ہے کہ مرا ٹبر شاہی محلے کے ساتھ بادشاہی مسجد کی دیوار سے کچھ دور پرے بھٹی لگا کر بیٹھا تھا، مگر وہاں زیادہ تر لوگ مکئی کے دانوں کے ساتھ ساتھ ہمارے ٹبر کو بھی بھوتے تھے اس لیے ہم وہاں سے داتا صاحب کے قریب فٹ پاتھ پر بیٹھ گئے اور اپنا کام شروع کر دیا، مگر یہاں بھی آس پاس والوں نے اپنی آگ اور ہمارے دھواں کو تکرار بنا کر ہمیں وہاں سے بھی اٹھا دیا پھر ہم سب شہر سے کافی دور بننے والی نئی آبادی گل برق چلے گئے اور ایک خالی جگہ پر بھٹی اور تندور لگا لیا، مگر دس پندرہ دہاڑے کے بعد ہی وہاں وڈی ساری گڈی کھڑی ہونے لگی اور گڈی والا نے ہمیں حکم دے دیا کہ یہاں سے دفعہ دور ہو جاؤ۔

ویسے بھی وہاں تندور اور بھٹی کی کوئی حاجت نہیں تھی ماما جب ہم وہاں سے اُٹھے تو پتہ نہیں سب کہاں چلے گئے کوئی مزدور بن گیا کوئی ٹھیکیدار اور کوئی پاندی اور میں یہاں آ گئی اور اس پلاٹ میں بیٹھ گئی، پہلے پہلے تو مالکوں نے مجھے بہت دھکے دیئے بار بار باہر نکالا، مگر پھر اپنے سیانوں سے مشورے کے بعد مجھے پلاٹ کی حفاظت والی کتی سمجھ کر رکھ چھوڑا اور جب سے میں اپنے دانے اولوگوں کی آنکھیں سیکھ رہی ہوں مائی مکئی سارا دن یونہی بغیر ڈوپٹے کے پھرتی ہے مگر کام کے وقت یہ سب سے پہلے ڈوپٹہ ڈھونڈتی ہے پھر ڈوپٹے کو سر پر رکھ کر کانوں کے پیچھے کرتی اور مروڑ کر گرہ لگا لیتی ہے یوں اس کے کانوں میں پڑے ہوئے بڑے بڑے چاندی کے بالے نمایاں ہو جاتے ہیں اور اس کے لچھے دار بال بھی آگ کی تپش سے بچ جاتے ہیں۔

مائی مکئی تندور اور بھٹی کے آس پاس دن میں تین چار بار جھاڑو لگاتی ہے پھر ڈول میں پانی لے کر ایک ہاتھ سے تروکا بھی لگاتی ہے اس کا کہنا ہے کہ یوں صفائی اور چھڑکا سے آس پاس کی تھان نظروں نظریں اچھی لگتی ہے تالے اچھی تھان اور اچھے منظر پر تو مائی مکئی کا دل خود دھمالیں ڈالتا ہے۔

مائی کہیں بیٹھے وہ گڑ کی ٹکی گڑ مکئی کے لڈو بھونے چنے گندم اور مٹھا باجرے کا ٹوکرہ ہمیشہ اپنے قریب رکھتی ہے تاکہ بچوں کو انتظار نہ کرنا پڑے۔ مائی بچوں کی اُن چیزوں پر والدین یا خود بچوں سے بھاؤ تاؤ نہیں کرتی جس نے جو مانگا دے دیا جس نے جو دے دیا رکھ لیا۔

مائی کے اسی برتاؤ کی وجہ سے آج کے بوڑھے بچے مائی مکئی کو یاد کرتے ہیں جگہ جگہ ڈھونڈتے ہیں مگر مائی کی کہیں نظر نہیں آتی لگتا ہے وہ بھاگتے دوڑتے وقت کی گرد و غبار میں کہیں گم ہو گئی ہے۔

☆☆☆☆☆

معروف فکشن نگار، نقاد محترم محمد حمید شاہد سے مکالمہ

سوال: ناول/ ناولٹ کی طرح افسانہ بھی اردو میں مستعار صنف ادب ہے، انگریزی ادب میں اسے شارٹ سٹوری کہا گیا ہے لیکن ہمارے ہاں 50 صفحات تک کے افسانے بھی لکھے گئے۔

چلیں شارٹ سٹوری کا متبادل افسانہ اردو میں رائج ہوا اور خوب لکھا گیا لیکن لفظ ناول / ناولٹ/ ڈرامہ سیریل کا متبادل اردو میں نہیں ہے اور وہ ایسے ہی بہترین انداز میں رائج بھی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا آج فلیش فکشن / مائکروفکشن کا متبادل نام ڈھونڈنا لازم ہے یا ان الفاظ کو جوں کا توں ہی رائج کیا جائے۔

جواب: آپ نے درست فرمایا، اصناف کے ناموں کی قبولیت کا نظام الل ٹپ ہے، اس ضمن میں کوئی فارمولا وضع نہیں کیا جا سکتا ہے- افسانے کا لفظ ہمارے پاس پہلے سے تھا، ہم قصوں میں کتھاؤں میں، داستانوں میں موجود افسانہ دیکھ لیا کرتے تھے لہذا شارٹ اسٹوری کے بجائے ہم نے مربوط اور منضبط کہانی کو افسانہ کہا اور یہی رائج بھی ہوگیا- یہ بھی بجا کہ ناول کے نام کو بدلنے کی ہم نے ضرورت محسوس نہ کی گئی، یہ ہماری داستان سے ہمارے قصوں سے اور کتھا کہانی سے الگ تھی تو ضرورت محسوس کی گئی کہ اسے الگ سے دیکھا جائے تو ناول نام کو ہی قبول کر لیا گیا، پھر اردو زبان کی ایک خوبی یہ بھی تو ہے کہ جو لفظ اور اصطلاحیں اسے بھلی لگتی ہیں، انھیں اپنالیتی ہے- ناول کو اس نے بہ خوشی اپنالیا ہے، یوں جیسے اس نے ریل، ریڈیو، فٹ بال وغیرہ کو اپنا لیا تھا- سوال یہ ہے کہ جب افسانچہ کا لفظ پہلے سے مروج ہے، تو کن بنیادوں پر آپ اس کے متبادل مائکرو فکشن، شارٹ شارٹ فکشن، فلیش فکشن جیسی اصطلاحات سے بدلنا چاہتے ہیں- ظاہر ہے یہ بنیادیں تیکنیک

سید تحسین گیلانی

اور فن کے حوالے سے افسانچے سے اسے الگ کر کے ہی فراہم ہو سکتی ہیں۔ میں ایسی بنیاد نہیں پا سکا ہوں ممکن ہے آپ اسے نشان زد فرما سکیں۔

سوال: انگریزی ادب میں مائکرو فکشن/ شارٹ شارٹ سٹوری/منی سٹوری/فلیش فکشن لکھا جا رہا ہے، اردو میں مائکرو فکشن انہاک فورم پر متعارف کروایا گیا ہے اور احباب نے 100 کے قریب تجرباتی مثالیں پیش بھی ہیں ہیں جن میں چند ایک اچھے مائکرو فکشن سامنے آئے ہیں۔ ہم مائکرو فکشن کو کیسے افسانچے سے الگ کر سکتے ہیں یعنی اس کی تکنیک/ اسلوب میں ایسا کیا ہو کہ یہ افسانچے سے الگ نظر آئے؟

جواب: میں اس باب میں آپ کی کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں مگر مجھے خدشہ ہے کہ جس طرح افسانچہ اردو میں مقبول نہ ہو سکا حالاں کہ اسے سعادت حسن منٹو، جوگندر پال اور منشا یاد جیسے باکمال لکھنے والے بھی میسر آئے، یہ پرانی شراب، انگریزی نام کی نئی بوتل میں بھی نہ چل پائے گی۔ یہاں نہ چلنا سے مراد اس تجربے کا تخلیقی سطح پر اتنا اہم ہو جانا ہے کہ لائق توجہ ہو جائے۔ ہمارے ہاں لطائف، دیہی دانش کی کہاوتوں، چٹکلوں اور حتیٰ کہ بولیوں کو بھی اسی طرح کا مختصر افسانہ بنا لیا جاتا ہے جو خوب خوب چلتا ہے مگر وہ تخلیقی تکریم نہیں پا سکتا جو افسانے کا مقدر ہو جاتی ہے۔ دراصل فکشن لکھنا محض کہانی لکھنا ہے نہ چٹکلا لکھ دینا؛ یہ تو زندگی کی ازسرنو تخلیق سے عبارت ہے۔

ہم لکھنے والے اپنے قاری کو پہلے اس منظر اس ماحول میں لے جاتے ہیں، وقت کی اس رفتار سے اسے ہم آہنگ کرتے ہیں جس میں لکھنے والا اس افسانے کی ضمن میں ہوتا ہے، ٹائم اور اسپیس افسانے کا بنیادی مسئلہ ہیں، انھی کو سلیقے سے کام میں لا کر گہرائی اور گیرائی کا اہتمام ہوتا ہے، بیان کا اتھلا پن ختم کیا جاتا ہے اور بیانیے کی تشکیل ممکن ہو پاتی ہے۔ کرداروں کو اپنا قد کاٹھ بنانا ہوتا اور اپنا لیے ایسی گنجائشیں پیدا کرنی ہوتی ہیں کہ محض ان کے بولے ہوئے مکالمے اہم نہ رہیں ان کی ایک ایک حرکت سے معنیاتی سلسلہ پھوٹتا رہے۔

افسانے کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ بتائے، اسے تو دکھانا اور اس سے کہیں زیادہ سجھانا ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال کو سجھانا جو بالعموم ہم بیان نہیں کر سکتے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ افسانچے یا فلیش فکشن (پوپ فکشن) کا تجربہ اردو میں نہیں ہونا چاہیے، لکھتے رہنے سے، اور ریاضت سے اس میں اچھے نمونے بھی نکل آئیں گے، یہ صنف

صحافتی ضرورتوں کو پورا کرسکتی ہے (اور کر رہی ہے) مگر میرا یہ گمان ہے (اللہ کرے یہ گمان باطل ہو جائے) کہ اس میں کوئی بڑا تخلیقی تجربہ ممکن نہیں ہے۔

سوال: انگریزی میں دوسطری مائکروفکشن موجود ہیں ہم اردو میں اسے رائج نہیں کرنا چاہتے۔ میرا نکتہ نظر یہ ہے کہ مائکروفکشن کو اردو میں تبدیلی / اضافت کے ساتھ نئی تکنیک کے ساتھ لکھا جائے کہ وہ اپنی الگ شناخت رکھتا ہو وہ کیا ہو؟؟

اکثر احباب مائکرو کو اس کے لفظی معنی (small) کے تناظر میں دیکھتے / لکھتے ہیں جب کہ میں اسے chipMicro کے معنوں میں لیتا ہوں یعنی جو تھوڑے میں بہت سمیٹ لے ایک ننھی منی سی تحریر جو بڑے مضامین اور موضوعات کو خود میں سمیٹ لے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: بھائی، میں اس سوال کے جواب میں کیا کہوں، مائکروفکشن کو آپ اردو میں رائج کرنا چاہتے ہیں، دوسطری خورد کہانی آپ کو پسند نہیں، گویا آپ کے ذہن میں اختصار کے لیے ایک پیمانہ ہے۔ کسی کہانی کے فکشن بننے کا بھی ایک پیمانہ ہوتا ہے۔ کہنے کو تو ہر لفظ ایک کہانی ہوتا ہے، لفظ یوں ہی تو رائج نہیں ہو جاتے نا، مثلاً دیکھئے لفظ ہے کربلا، پوری ایک کہانی، لفظ ہے آدمی، کیا یہ کہانی نہیں ہے۔ خرابی یہ ہوتی ہے کہ ہم ان لفظ کو لڑھکا کر لغات کی ٹوکری میں پھینک دیتے ہیں اور یوں ان لفظوں سے منسلک کہانی فقط معنی میں بدل جاتی ہے۔ یاد رکھیے افسانہ محض معنی تک محدود نہیں رہتا، یہ معنی سے زیادہ کے امکانات رکھتا ہے۔ اچھا، الفاظ سے کہانی کے امکانات کو کوئی جہت دینے کے لیے ہم اسے جملوں میں استعمال کرتے ہیں، مگر محض ایک جملہ یا چند جملے چاہے کتنے ہی بامعنی کیوں نہ ہوں، ایک حصار بناتے ہیں، کچھ بتانے کا حصار، افسانہ بہت کچھ بجھانے کے لیے معنی کی محدودیت کے اس حصار کو توڑتا ہے، اس کے لیے وہ مختلف وسیلوں کو کام میں لاتا ہے، میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ خرد کہانی میں ان وسیلوں کو کام میں لایا جاسکتا ہے اور خرد افسانہ، ایک دانش پارے یا چٹکلے سے زیادہ کچھ ہو سکتا ہے، فوری اثر کرنے والا مگر ڈسپوز آف ہو جانے والا فاسٹ فکشن۔

سوال: دور جدید میں اس صنف کی اہمیت کو آپ کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: یہ صنف چوں کہ معنی کی ترت ترسیل کا وصف رکھتی ہے، لہٰذا اسے صحافتی طور پر کامیابی سے برتا گیا ہے، برتا جارہا ہے اور برتا جاسکے گا۔

☆☆☆☆☆

غزل

خاک پر خاک کی ڈھیریاں رہ گئیں
آدمی اُٹھ گئے ، نیکیاں رہ گئیں

کس کی تعلیم کا ، آخری سال تھا
چوڑیاں بک گئیں بالیاں رہ گئیں

عشق اک روپ تھا، حسن کی دھوپ کا
یاد کیوں دھوپ کی سختیاں رہ گئیں

خون میں گھل گئیں سانولی قربتیں
تن میں تپتی ہوئی ہڈیاں رہ گئیں

درد ، انگور کی بیل تھے ، پھل گئے
غم کشوں کے لیے تلخیاں رہ گئیں

عرصۂ فسق میں ، قسمتِ عشق میں
حکمت آمیز پسپائیاں رہ گئیں

قمقموں کی طرح قہقہے جل بجھے
میز پر چائے کی پیالیاں رہ گئیں

اس بلندی پہ ہم نے پڑاؤ کیا
جس کے آگے فقط پستیاں رہ گئیں

حسن کے ہاتھ سے آئنہ گر پڑا
فرشِ پندار پر کرچیاں رہ گئیں

ہم نے کاغذ کو بھی آئنہ کر دیا
لیکن اپنی سیہ بختیاں رہ گئیں

خالد احمد

غزلیں

یہ راستے کی رفاقت ہے بے خبر نہیں ہم
دفاعِ حرف میں ہم صف ہیں، ہم نظر نہیں ہم

عجیب رنگ سے ہیں گھورتے در و دیوار
کبھی کبھی تو یہ لگتا ہے اپنے گھر نہیں ہم

ہمیں گرانے سے پہلے ہزار بار یہ سوچ
کنارِ فصل کوئی نخلِ بے ثمر نہیں ہم

ہٹا یہ لہجۂ تخفیف تا کھلے تجھ پر
شگفتِ گل ہیں کوئی شعلہ و شرر نہیں ہم

ہو جس کی جیسی بھی رائے، ہوں فیصلے جو بھی
خلَل کسی کے بھی فکر و شعور پر نہیں ہم

یہی بہت ہے کہ ہیں کچھ کھری نگاہوں میں
بلا سے موسمی میلوں کے معتبر نہیں ہم

ادھورے خواب، ادھورے یقیں، ادھوری وفا
خفا کسی سے بھی اب، قصہ مختصر، نہیں ہم

تمام عمر غزل کے فنوں کی دھن میں کئی
ہوئے کچھ ایسے ابھی واقفِ ہنر نہیں ہم

حیات ہونے نہ ہونے کی ہے کتھا عالی
اور اِس کتھا میں بہت کم ہیں بیشتر نہیں ہم

جلیل عالی

قریب و دُور تمام اپنی مملکت کیا ہے
کہ دل نے فرش کو بستر، فلک کو چھت کیا ہے

قلم کو خم نہ کبھی بہرِ مصلحت کیا ہے
ہزار خوف ہو کارِ مزاحمت کیا ہے

یہ ایک ہجر جو ہم نے تمام عمر جیا
اِسی نے دل کو شناسائے معرفت کیا ہے

ہر ابتلا نے سجھائی ہے کوئی حکمتِ نو
ہر انتشار نے کچھ اور منضبط کیا ہے

بصیرتیں کہاں جو دیکھ لیں ذرّوں کے فسوں
بصارتوں نے گرفتارِ خال و خط کیا ہے

اب ایسے عدل کو لے جائیں کس عدالت میں
کہ جس نے ظلم کی چھت کو ہمیشہ پٹ کیا ہے

کوئی گماں ہو کہ دُبدھا، کوئی خوشی ہو کہ غم
سخن کو ہم نے سبیلِ مشارکت کیا ہے

مٹا چکا تھا وہ سب تاب و تب اور اب عالی
بیاضِ خواب کو اُس نے پرت پرت کیا ہے

غزل

اسی میں عمر گزاری ٹھکانہ ٹھیک لگا
بھرے درخت میں جو آشیانہ ٹھیک لگا

یہی بہت ہے محبت کی آبرو رکھ لی
اسی کے ساتھ ہمیں ہر زمانہ ٹھیک لگا

مزاج وقت بدلتا رہا مگر ہم نے
جسے قبول کیا والہانہ، ٹھیک لگا

تلاش کر نہ سکا درد میرے لفظوں میں
اسے مزاج مرا شاعرانہ ٹھیک لگا

بیاں ہوا مرا کردار بھی کہیں نہ کہیں
اسی لیے مجھے اس کا فسانہ ٹھیک لگا

معاملات محبت میں بھول چوک تو ہے
مری طرف سے اسے ہر بہانہ ٹھیک لگا

کسی سے عشق مری داستاں میں آتا رہا
کسی سے عشق مجھے غائبانہ ٹھیک لگا

مقامِ ہجر پہ جلوہ نما تھے حضرتِ عشق
وہیں پہ بیٹھ گئے آستانہ ٹھیک لگا

نظر کے تیر تھے چاروں طرف سے آتے ہوئے
کنور میں خوش ہوں کہ میرا نشانہ ٹھیک لگا

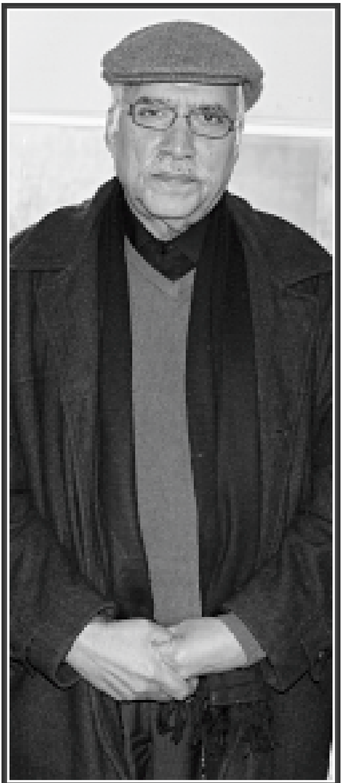

اعجاز کنور راجہ

غزل

غفلت شعار، دیکھ کوئی دیکھتا بھی ہے
جب سر پہ آ پڑے گی، وہی آسرا بھی ہے

پائے ثبات، تیرِ نظر، عزمِ بے پناہ
سدِ سکندری ہے مگر راستہ بھی ہے

گم کردہ آشیاں سہی، بے کارواں سہی
اندر کی روشنی مجھے قبلہ نما بھی ہے

چاروں طرف ہے نور مگر دل کے نور سے
آنکھوں میں روشنی کا کوئی سلسلہ بھی ہے

حیرانیوں کو دیکھ کے منہ کو چھپا لیا
ان مول موتیوں کو کوئی تولتا بھی ہے

سب کے نصیب میں کہاں رفعت شناسیاں
آخر دہانِ غار کوئی کھولتا بھی ہے

اس پر فصاحتوں کے کھلیں گے ہزار در
جو بولنے سے پہلے اسے تولتا بھی ہے

وا ہے دل و نگاہ پہ نظارہ جمال
یہ رات ہے تو آخرِ شب رتجگا بھی ہے

بے ساختہ حروف و معانی سے بے نیاز
شفاف آنسوؤں میں کوئی بولتا بھی ہے

وہ جو متاعِ فکر کبھی آرزو رہی
اس کو ہنر ریاض کا اب ڈھونڈتا بھی ہے

سید ریاض حسین زیدی

غزل

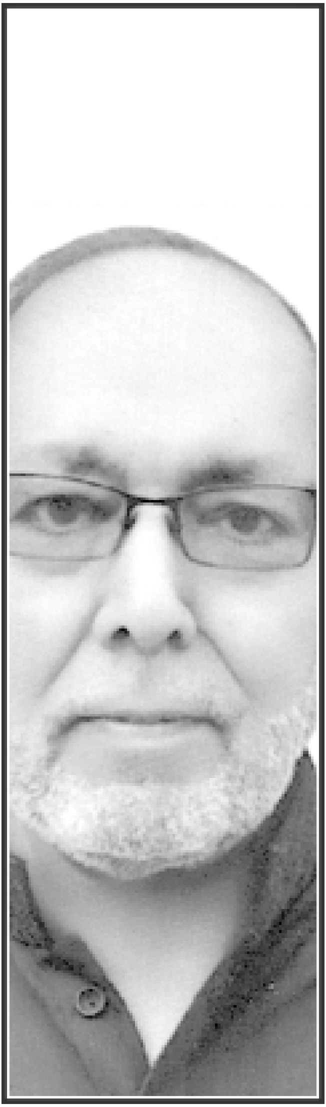

نسیمِ سحر

روش روش پہ کھلے موسمِ بہار کے پھول
چمن میں ہم نے اُگائے ہیں جب سے پیار کے پھول

یہ دھرتی امن کا گہوارہ بن بھی سکتی ہے
کھلائے جائیں دِلوں میں جو اعتبار کے پھول

مہک رہا ہے گلستانِ زیست پھولوں سے
کچھ انتظار کے ہیں، کچھ ہیں یادِ یار کے پھول

قبول ہیں مجھے کانٹے بھی اپنی منزل کے
مجھے پسند نہیں ہیں یہ رہگذار کے پھول

کسی پرائے گلستاں سے کیا غرض ہے ہمیں!
ہمیں پسند ہیں خود اپنے ریگزار کے پھول

دیارِ غیر کے گُل دیدہ زیب ہوں گے مگر
مجھے پسند فقط اپنے ہی دیار کے پھول

مرا سوال یہ گلچیں سے ہے، بتائے نسیم
ملے گا کیا اُسے شاخوں سے یوں اُتار کے پھول؟

غزل

دوامِ عیش کو حاصل نہ رنجِ پیہم ہے
حیات کیا ہے نشاط و الم کا سنگم ہے

ہمیشہ ایک سے حالات رہ نہیں سکتے
خبر ہے سب کو تغیر نصیبِ عالم ہے

بغیر اس کے کوئی بات ہی نہیں بنتی
خلوص و خیر محبت کا جُزوِ اعظم ہے

کوئی گمان بھی آنے نہیں دیا میں نے
خدا کی ذات پہ میرا یقین محکم ہے

مرے لیے اسے مخصوص کر دیا تُو نے
تری نگاہِ فسوں کار ہے کہ محرم ہے

اسی کے واسطے فتحِ مبین درج ہوئی
وہ جس کے ہاتھ میں صبر و رضا کا پرچم ہے

ہر ایک زخم ہے سینے میں خونچکاں گلزار
غلط کہا ہے کسی نے کہ وقت مرہم ہے

گلزار بخاری

غزلیں

کوچہ کوچہ دیپ جلاتا پھرتا ہوں
تاریکی میں جشن مناتا پھرتا ہوں

ہے کوئی حرف و صوت و صدا کا متوالا
گلی گلی آواز لگاتا پھرتا ہوں

روشن کرتا ہوں تاریک جبینوں کو
ذرّوں کو خورشید بناتا پھرتا ہوں

باہر تو باہر ہے، ڈر کے مارے مَیں
گھر میں بھی تسبیح گھماتا پھرتا ہوں

اپنی راہ کا پتھر مَیں خود ہوں لیکن
دُنیا کو رستے سے ہٹاتا پھرتا ہوں

مندر ہو یا مسجد ہو یا گرجا گھر
ہر جا اُس کے ناز اُٹھاتا پھرتا ہوں

سہما رہتا ہوں گھر کی دیواروں سے
خود سے بھی مَیں خود کو بچاتا پھرتا ہوں

جن کے نقش ہیں لوحِ جہاں پر، مَیں اُن کی
دھول ہوں اور بس خاک اُڑاتا پھرتا ہوں

پلکوں پلکوں آنسو چنتا ہوں خاور
آنکھوں آنکھوں خواب سجاتا پھرتا ہوں

خاور اعجاز

کیسے اُڑتے ہیں اسیرانِ قفس، جانتا ہوں
باغِ ہستی میں یہ فن مَیں ہی تو بس جانتا ہوں

بادِ صرصر سے مجھے خود ہی نمٹنا ہو گا
ساتھ دیں گے مرا گُل، خار نہ خس، جانتا ہوں

مجھ سے پوشیدہ نہیں فکر و نظر کی باتیں
جیسی تم جانتے ہو ویسی مَیں دس جانتا ہوں

واعظو! پند و نصیحت کو رکھو پاس اپنے
مہلتِ عیش ہے دو چار برس، جانتا ہوں

بے حجابی میں اُسے دیکھنے کی حسرت ہے
اہلِ بینش کو بھی مَیں اہلِ ہوس جانتا ہوں

کیسی بے تاب ہے دریا میں ڈبونے کے لیے
بے قراری تری اے موجِ نفس! جانتا ہوں

غزل

بسا ہے جب سے تصور ترا خیالوں میں
ہے میرے عشق کا چرچا پری جمالوں میں

تری مثال کی صورت گہر نہ گل نہ قمر
عبث تلاش کیا ہے تجھے مثالوں میں

نہ دشت میں اسے آسودگی نہ رستوں میں
غزالِ حسن اچھوتا ہے سب غزالوں میں

اذان دیتے رہیں آپ دل کی مسجد میں
گریں گے ٹوٹ کے بُت ذہن کے شوالوں میں

اُسے جہان کے شیر و شکر سے کیا نسبت
کہ جس کو زیست ملی زہر کے پیالوں میں

مرے جنوں کے حواشی تمہارے حسن کے ساتھ
ملے کتاب محبت کے سب حوالوں میں

سبھی کو میں نے سنائی تھی داستانِ الم
کوئی نہ میرا بنا میرے سُننے والوں میں

وہ شان قیصر و جم کو ملی نہ کوشش سے
جو شان دیکھی ہے میں نے شکستہ حالوں میں

اگرچہ خاسر و قاصر ہوں آج میں سبطین
ابد کا نُور ہے روشن مرے کمالوں میں

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

غزل

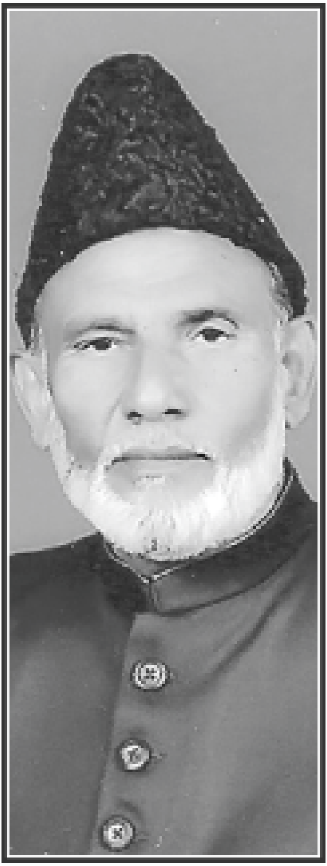

میں چاہتا ہوں مرے سارے زخم سِل جائیں
وہ چاہتا ہے اُسے اور تیر مل جائیں

کچھ ایسا لاسہ لگایا ہے اُس کی چاہت نے
مجال کیا ہے کہ اپنی جگہ سے ہِل جائیں

جنوں سے بیر خرد کا بہت پرانا ہے
مرے خلاف یہ دونوں کہیں نہ مِل جائیں

کھلیں گے پھول تو وحشت تو جاگ اٹھے گی
مچل رہا ہے مگر دل کہ پھول کھل جائیں

ستم ظریف کو ہر دم کرید رہتی ہے
چھلے تھے زخم کہیں مندمل نہ ہو جائیں

عجب نہیں کہ وہ ساجد پہ رحم فرمائیں
یہ جی میں ہے کہ پہن کر قبائے گل جائیں

شریف ساجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

الگ جہاں سے تھے، لیکن جہاں کے ساتھ رہے
غبار ہو کے بھی ہم، کارواں کے ساتھ رہے

غزل

جل گیا چہرہ تو رنجش نہیں کی
صرف آئینے کی خواہش نہیں کی

ہم دلاور تو نہیں تھے لیکن
کوئی دھوکا کوئی سازش نہیں کی

مرتکب جرم کے بھی ہم نہ ہوئے
اور بچنے کی بھی کوشش نہیں کی

اس کا دکھ اپنے لئے مانگ لیا
ہم نے بیمار کی پرسش نہیں کی

ایک سا تجربہ کیا دہراتے
دوسری بار وہ لغزش نہیں کی

التجائیں بھی پلٹ آتی ہیں
سو کبھی ہم نے گذارش نہیں کی

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کسی کے حسن کا انکار کفر ہے خالد
سو اپنے عشق کا انکار کر کے دیکھتے ہیں

غزل

اُلٹا ہی پڑا میں نے جہاں داؤ لگایا
پتا نہیں نکلا کبھی نمبر نہیں آیا

حیراں ہوں کہ تم اب بھی مرے ساتھ ہو ورنہ
مشکل میں تو رہتے نہیں دیکھا کبھی سایا

لے اُڑتی ہے دنیا تو یہاں آنکھ سے کاجل
حیرت ہے اگر آپ نے دھوکا نہیں کھایا

تحریر کو تصویر بنانے کے ہنر سے
جو دیکھا زمانے کو بھی ویسا ہی دکھایا

وہ ساز ہوں میں جو کبھی چھیڑا نہ کسی نے
وہ گیت ہوں جس کو کہ کسی نے نہیں گایا

مایوس نہ ہو راہ کی دشواری سے راحت
تقدیر کسی وقت پلٹ دیتی ہے کایا

راحت سرحدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

محفلِ ماہتاب میں نجمِ سحر نہیں تو کیا
لاکھ نیاز مند ہیں، ایک اگر نہیں تو کیا

غزل

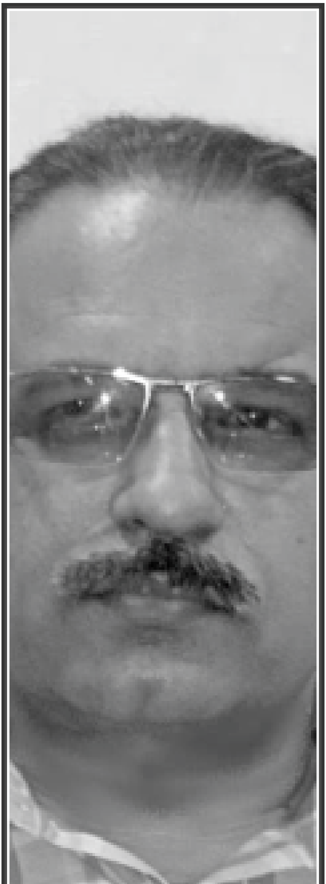

نظریں ملاتا ، ہنستا ہنساتا چلا گیا
میں گنگناتا ، ہاتھ ہلاتا چلا گیا

تھا زندگی میں اک بھلے مانس کا رول بھی
میں وہ پسند کر کے نبھاتا چلا گیا

آنکھوں سے ہاتھ دھو لیے دیدار کے لیے
سجدے میں کیا گرا ہوں کہ ماتھا چلا گیا

کیسی کشش میں آیا کہ سب عالمِ وجود
اک روزنِ سیہ میں سماتا چلا گیا

تنگ آ کے شورِ جشنِ عقیدت سے ایک دن
اپنا مزار چھوڑ کے داتا چلا گیا

دستک نے زور دے کے جو پوچھا کہ کوئی ہے؟
دروازہ چیختا گیا، تھا ! تھا ! چلا گیا !

راہوں میں یہ اندھیرا کسی اور سے نہیں
خود آدمی چراغ بجھاتا چلا گیا

دکھ ہے کہ اس کے ماننے والے بھی کم نہیں
جو قافلے کو اُلٹا چلاتا چلا گیا

رحمان حفیظ

غزل

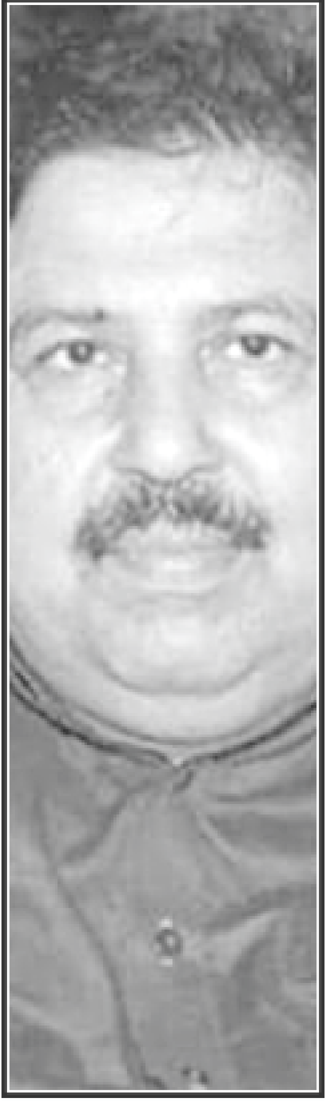

مسعود احمد

ویسے تو سفر سارا بہت خوب رہا ہے
پہنچا ہوں کنارے پہ تو دل ڈوب رہا ہے

افسوس ہے، لالچ میں اسے کاٹ رہا ہوں
جس پیڑ کا سایہ مجھے محبوب رہا ہے

مجنوں کی طرح اس کی بھی اپنی ہے کہانی
یہ چاند کبھی جھیل سے منسوب رہا ہے

دن رات حوادث نے کیا ہے اسے پتھر
یہ دل بھی کبھی درد سے مغلوب رہا ہے

دن رات جہاں چلتی ہیں نفرت کی ہوائیں
اس شہر کا موسم کبھی مرطوب رہا ہے

کس کس نے بہایا ہے مرا خون پسینہ
کس کس کا پسندیدہ یہ مشروب رہا ہے

بھیجی ہیں لفافے میں بھی بھیگی ہوئی آنکھیں
لفظوں سے بغاوت مرا اسلوب رہا ہے

غزل

بس یہ تھوڑی سی توجہ مجھ کو اعزازی لگے
ورنہ خاموشی کسی خدشے کی غمازی لگے

یہ محبت میرا ذاتی مسئلہ ہے اس لیے
اک دلاسا بھی کسی کا دخل اندازی لگے

اب اچانک مل گئے ہیں تو پرانے دوستو!
قہقہے مل کر لگائیں ، تاش کی بازی لگے

عشق خاص و عام میں کرتا نہیں ہے امتیاز
یہ جنوں کا سلسلہ بھی قرعہ اندازی لگے

اس قدر پختہ در و دیوار کی تعمیر سے
گھر بنانے کا عمل بھی مقبرہ سازی لگے

زندگانی کی حکایت لکھ رہا ہوں اس لیے
مجھ کو اپنا آپ گویا سعدی شیرازی لگے

آگے بڑھنے کے لیے لازم ہے پیچھے دیکھنا
شاہد اشرف زندگی شطرنج کی بازی لگے

شاہد اشرف

غزل [احمد جاوید کی نذر]

ہو گئے جب سے سبک بارِ جہانبانی سے ہم
مشکلوں میں بھی بسر کرتے ہیں آسانی سے ہم

شکل کوئی اور ہی آتی ہے اب اس میں نظر
آئنے کا سامنا کرتے ہیں حیرانی سے ہم

خوش نظر آنے کا مطلب یہ نہیں کہ غم نہیں
ہاں مگر گھبرا نہیں جاتے پریشانی سے ہم

آپ اسے گریہ سمجھ کر بالکل افسردہ نہ ہوں
زخم دل کا دھو رہے ہیں آنکھ کے پانی سے ہم

بوجھ کپڑوں کا بڑھاتے جا رہے ہیں جسم پر
اور واقف ہی نہیں ہیں اپنی عریانی سے ہم

وحشت میں دن رات کا آنا بھی کھلتا ہے ہمیں
کس قدر مانوس تھے کمرے کی ویرانی سے ہم

بند آنکھوں کے دریچے اور ہونٹوں پر ہے قفل
اب تو اپنے آپ کو لگتے ہیں زندانی سے ہم

سوئے مقتل کھینچتی ہے خون کی ایسی کشش
"جادۂ شمشیر سر کرتے ہیں پیشانی سے ہم"

لوگ جاں تک بیچتے ہیں مہ جبینوں کے لئے
معرکے سر کرتے ہیں ایسے تن آسانی سے ہم

شاعری بزمِ سبو مہتاب زلفِ مشکبار
رات ہے مانوس ہم سے رات کی رانی سے ہم

اس لئے جاذب ہمیں دنیا کی اب پروا نہیں
عشق فرمانے لگے ہیں راجپوتانی سے ہم

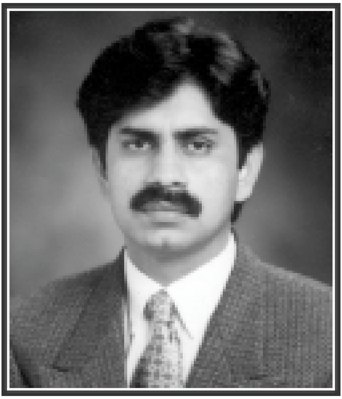

شکیل جاذب

غزل

عماد اظہر

آئنہ شہرِ نگاراں سے چلا جائے گا
داغ یہ چاکِ گریباں سے چلا جائے گا

چشم گریاں ہے، فسردہ ہے، گرفتہ ہے بہت
دل مدینہ سے نہیں، جاں سے چلا جائے گا

گونج ایسی ہے کہ آوازِ خدا سے پہلے
وسوسہ اب کے بیاباں سے چلا جائے گا

منظرِ ارض و سماوات اٹھائے کوئی
ایک دن چشمِ پشیماں سے چلا جائے گا

آخرِ کار کوئی جائے تمنا کی طرف
مسکراتا ہوا زنداں سے چلا جائے گا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

فن و فنکار میں رشتہ ہے گل و خوشبو کا
فن و خوشبو بھی سرِ دوشِ ہوا رہتے ہیں

غزل

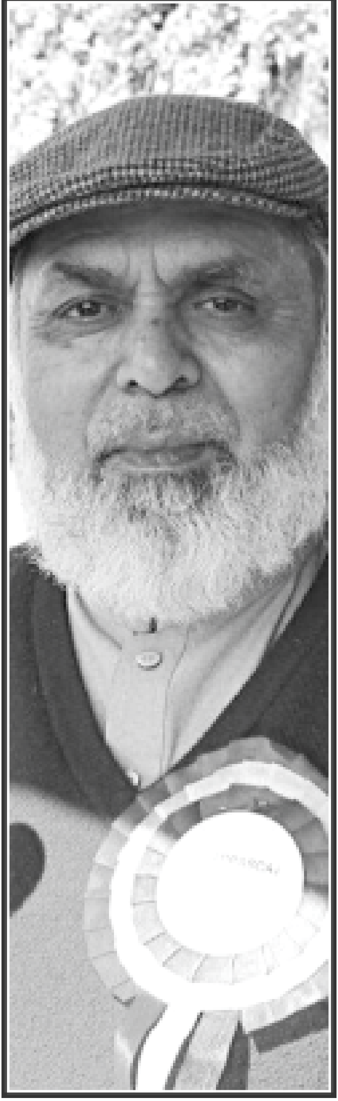

اے نیند دیویو! اتنا خیال رکھنا ہے
ہر ایک آنکھ میں خوابِ وصال رکھنا ہے

کسی بھی وقت ہمیں پھر سے ایک ہونا ہے
یہ ختم ہوتا تعلق بحال رکھنا ہے

اُتارنا ہو اگر اس کو کینوس پہ کبھی
کلر پلیٹ میں رنگِ جمال رکھنا ہے

ستارے دیکھ رہے ہیں بلندیوں سے بہ غور
کہاں تلک ہمیں زیرِ زوال رکھنا ہے

یہی نہیں ہے، کہ بس زندگی گزارنی ہے
دیارِ فن میں نمایاں کمال رکھنا ہے

میں، علم، جستجو، تہذیب چھوڑے جا رہا ہوں
نژادِ نو! مرا ورثہ سنبھال رکھنا ہے

حسین چہروں کی اس سلطنت میں جانِ انیس!
حریمِ دل میں وہی گُل مثال رکھنا ہے

محمد انیس انصاری

غزل

اتنی خبر تھی ہو گا ہواؤں سے سامنا
پھر بھی چراغِ جاں کو منڈیروں پہ رکھ دیا

میں جانتا ہوں موت سے ممکن نہیں فرار
لیکن جو شخص اپنی جوانی میں مر گیا

کیسے کریں گے پار محبت کا پل صراط
بوسہ جبیں کا اس کی ہتھیلی پہ رکھ دیا

اک آرزو تھی بخت کے صحرا میں کھو گئی
اک خواب تھا جو نیند کے بستر سے گر پڑا

یہ آنکھ ہو چلی تھی اندھیروں کی ہم نوا
پھر ایک روز آپ کا بندِ قبا کھلا

وہ شخص روشنی میں ہوا ایسا بدحواس
جلتے ہوئے چراغ کے قدموں میں گر پڑا

چاہے ذرا سی دیر کو آیا میں بام پر
شہرِ ہنر کی آنکھ میں کانٹا تو لگ گیا

اے آستاں پہ بیٹھے ہوئے بامراد شخص
یہ دیکھ میرے ساتھ محبت نے کیا کیا

افتخار شاہد

غزل

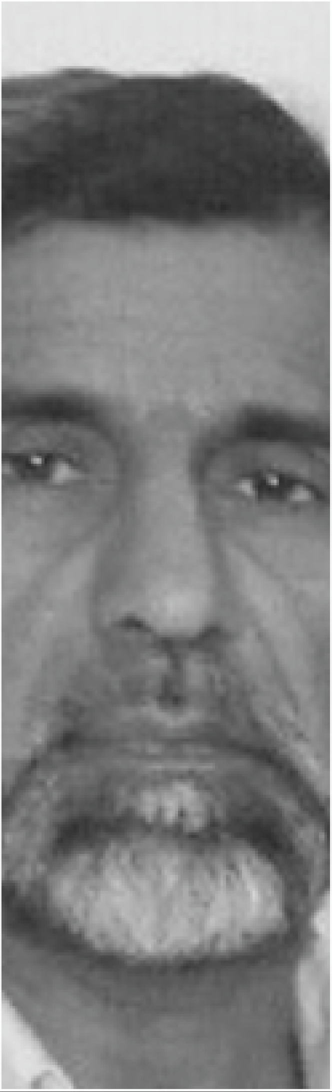

دل میں غبار زرد تھا چہرہ سیاہ تھا
ظلمت گزیدہ چاند مگر بے گناہ تھا

رستہ جسے ملا تھا وہ رستے میں رہ گیا
منزل اُسے ملی کہ جو گم کردہ راہ تھا

مقتول خود ہی قتل پہ اپنے رہا خموش
عادل کی بات کیا ہو کہ وہ کم نگاہ تھا

تاروں کی ہم نوا تھی چراغوں کی ہم جلیس
لیکن نصیب رات کا پھر بھی سیاہ تھا

شب زادگاں سے دشمنی کوئی نہ تھی مری
میرے بدن کی دھوپ ہی میرا گناہ تھا

منصف نے اِس لیے تو کیا ہے اُسے بری
قاتل خود اپنے جرم کا عینی گواہ تھا

اب اُس کا کم نصیب فلسطینی کیا کریں
خورشید شہر بھر میں جو یوم سیاہ تھا

خورشید ربانی

غزلیں

آنکھ پر خواب جب اُتارے گئے
نیند کے بال و پر سنوارے گئے

تُو نے تو صرف تخت دیکھا ہے
ہم سرِ دار بھی پکارے گئے

اُن پہ قربان ہو رہا تھا جہاں
میرے جیسے تو یونہی مارے گئے

تیرے قدموں کی ایک آہٹ پر
پھُول کے ہار تھے جو وارے گئے

عشق کی واردات میں اقبال
حُسن کے تخت سے اُتارے گئے

اقبال سروبہ

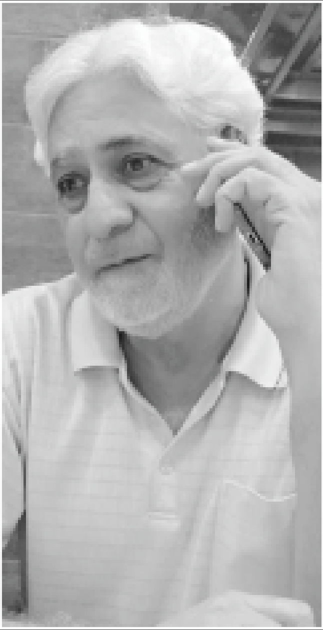

میرے پاؤں میں نہ آئے گی کبھی زنجیر تک
نیند میں چلتا رہوں گا خواب کی تعبیر تک

رنگ سارے تو چُرا کر ساتھ اپنے لے گیا
میں فقط محدود ہو کر رہ گیا تصویر تک

اب مرے کاسے میں اِک سکہ نہیں جو دے سکوں
بیچ بیٹھا ہوں میں اپنے باپ کی جاگیر تک

واپسی کا اب سفر ممکن نہیں تُو لوٹ جا
میں بہت مشکل سے پہنچا ہجر کی تاثیر تک

آج کل کے عاشقوں نے دشت دیکھے ہی نہیں
اِک مشقت چاہیے ہے اب کے جوئے شیر تک

ہاتھ تھاما ہے تو پھر اقبال ڈر کس بات کا
میں تمہارے ساتھ ہوں تم لے چلو کشمیر تک

غزل

بارِ الفت کو مری جان اُٹھانے آؤ
حوصلہ دل میں اگر ہے تو دکھانے آؤ

پھر وہی رنگِ وفا ہم کو دکھانے آؤ
اک نئی چوٹ نیا زخم لگانے آؤ

کس طرح تم کو مناتے تھے کبھی یاد کرو
آج ہم روٹھ گئے ہیں تو منانے آؤ

کچھ دنوں سے کوئی دُکھ، رنج و الم، غم بھی نہیں
ہم بہت خوش ہیں، ہمیں پھر سے رُلانے آؤ

زخم سب بھر گئے، موسم بھی نئے آئے ہیں
بجھ گئیں شمعیں انہیں پھر سے جلانے آؤ

آج بھی تم سے ہی وابستہ ہے امیدِ وفا
آخرش میری یہ اُمید مٹانے آؤ

دلِ معصوم کو تم پہ ہے یقیں آج تلک
پھر سے اے وعدہ شکن وعدہ نبھانے آؤ

دلِ افروز کو آباد کیا تھا تم نے
مرے اُجڑے ہوئے گلشن کو بسانے آؤ

افروز رضوی

غزل

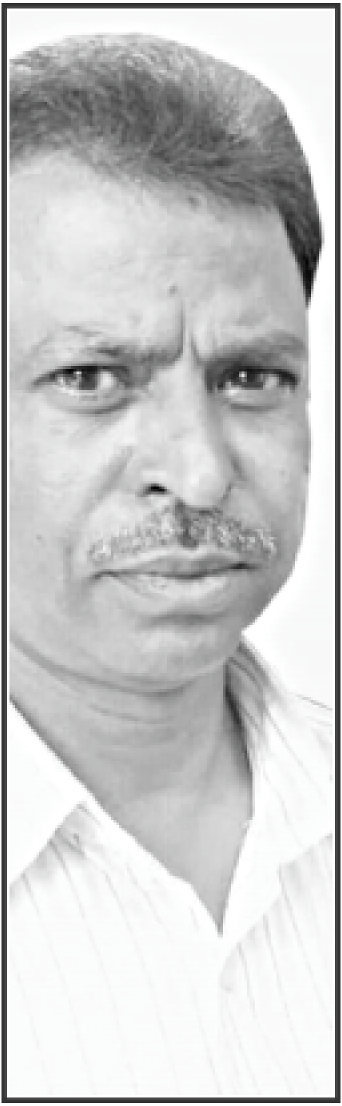

میل کے پتھر پر اپنی آنکھوں کو دھرنا بھول گیا
تو نے مجھے رفتار ہی وہ دی ہے کہ ٹھہرنا بھول گیا

اس لئے کہتا ہوں اونچی پروازوں سے باز آؤ
جو بھی امبر پر جا پہنچا نیچے اترنا بھول گیا

آج ہی میں افلاک کی وادی میں اس کو آؤں گا نظر
وہ غلطی سے میرے پروں کو آج کترنا بھول گیا

میں نے اس کی عصمت کو محصور کیا محفوظ کیا
میرے ہاتھوں میں آ کر اک پھول بکھرنا بھول گیا

اس کی سانسیں لمحہ لمحہ زندگی پاتی جاتی ہیں
تجھ کو دیکھ کے مرنے والا جیسے مرنا بھول گیا

میرے بھی دل میں اب اس کو پانے کی حسرت بچی نہیں
وہ بھی میری خاطر شاید آہیں بھرنا بھول گیا

میں نے بسا رکھا ہے اس کو اپنی آنکھوں کے اندر
آئینے کے آگے اب وہ پہروں سنورنا بھول گیا

اس پر میرے پیار کا ایسا جادو چلا ہے کیا کہئے
اب وہ اپنے وعدے سے بھی یار مکرنا بھول گیا

ذکی طارق

غزلیں

سب رنگِ نقش نقش فنا کر دیے گئے
خوشبو کے قافلے سے جدا کر دیے گئے

اے کوفۂ جدید کے مکتب! خیال کر
ہر کربلا نہاد تھے، کیا کر دیے گئے

دو چار پات ہی تو بچے تھے درخت پر
اور وہ بھی نذرِ موجِ ہوا کر دیے گئے

وہ زخم بھی سنبھال کے رکھے ہیں افتخار
اس بزم سے جو پھول بنا کر دیے گئے

اک حادثے پہ اور تو کچھ بھی نہ ہو سکا
دو ہاتھ تھے سو وقفِ دعا کر دیے گئے

محمد افتخار شفیع

خاک تہِ ہستی میں سمانے کے لیے ہیں
ہم لوگ کسی اور زمانے کے لیے ہیں

یہ راہ میں بیٹھے ہوئے آوارہ صفت لوگ
کیا جانیے کیوں اڑانے کے لیے ہیں

ہم غازۂ شب تھے کبھی لوگوں کی نظر میں
اب نورِ سحر ہیں تو زمانے کے لیے ہیں

آوارۂ منزل ہیں سو منزل کی ہوس میں
سب رختِ سفر اپنا لٹانے کے لیے ہیں

کہنے کو تو سن لیتے ہیں احوالِ غم آباد
کچھ دیر یہاں ہم بھی ٹھکانے کے لیے ہیں

غزل

دیکھے بغیر آئنہ خود پہ فریفتہ تھا میں
ایک پری تھی سامنے جس سے ڈرا ہوا تھا میں

شعبدہ گر کی تیغ سے کون مرا ہے آج تک
ویسے تو ایک شخص کے دل میں اتر گیا تھا میں

یاد کے دو کنوؤں میں ہم لٹکے رہے الگ الگ
پانی کو دیکھتا تھا وہ، چاند کو دیکھتا تھا میں

خشک بدن اور آنکھ نم، زرد زیادہ، سبز کم
خواجہ سرا کا گیت تھا، صحرا کا واقعہ تھا میں

روز یہی معاش ہے، سامنے ایک لاش ہے
اس کو اٹھا رہا ہوں اب، جس کو سلا رہا تھا میں

جلدی میں لڑکھڑا گیا کرسی پہ بیٹھتے ہوئے
پھر جو ہنسی وہ دشت بن، خوف سے بھر گیا تھا میں

اور تھی تیرگی مری، اور تھا دن کا زاویہ
چاند عزیز تھا مجھے، شب کا بیانیہ تھا میں

میر کی بزم ہے کہاں، دیکھی ہیں صرف سیڑھیاں
چار قدم اتر گیا، ایک قدم چڑھا تھا میں

ذوالفقار عادل

غزل

رکا ہوا ہوں کہ چل رہا ہوں خبر نہیں ہے
میں کیسے منظر میں ڈھل رہا ہوں خبر نہیں ہے

چراغ ہوں اور ہوا سے جاری ہے کھیل میرا
میں بجھ گیا ہوں کہ جل رہا ہوں خبر نہیں ہے

گرانے والے مجھے گرا کر چلے گئے ہیں
میں کیسے اٹھ کر سنبھل رہا ہوں خبر نہیں ہے

کہاں میں ڈوبا تھا یاد ہے وہ تمام منظر
کہاں سے آ کر نکل رہا ہوں خبر نہیں ہے

یہ کیسی خوشبو ہے روح سرشار کرنے والی
میں کس چمن میں ٹہل رہا ہوں خبر نہیں ہے

یہ کس کی تاثیر نے سحر کی نوید بخشی
یہ کیا میں آنکھوں پہ مل رہا ہوں خبر نہیں ہے

وہ پیڑ ہوں جس کو کاٹنے میں لگے ہیں سارے
میں پھر بھی کیوں پھول پھل رہا ہوں خبر نہیں ہے

یہ کس نے شمشیر اپنے خوابوں میں زندہ رکھا
میں کس کا ذہنی خلل رہا ہوں خبر نہیں ہے

شمشیر حیدر

غزل

سر خم کیا نہ ہم کبھی زیرِ نگیں ہوئے
تب کارزارِ عشق میں روشن جبیں ہوئے

ہم ہیں طریقِ عشق پہ حق الیقیں کے ساتھ
سو ہم کبھی شکارِ تذبذب نہیں ہوئے

تشبیہ، استعارا، نہ جس کی کوئی مثال
دنیا میں آپ ایسے یگانہ حسیں ہوئے

جس سمت دوستوں کی صفیں ہیں بنی ہوئیں
شامل اب ان صفوں میں بھی کچھ حاسدیں ہوئے

جب تک تھے آسمان پہ نازِ فلک تھے ہم
آئے ہیں جب زمیں پہ تو زیبِ زمیں ہوئے

ہم ارتقائے عشق کے قائل ازل سے ہیں
یعنی کہ ہم گماں سے ہی اہلِ یقیں ہوئے

یہ تشنگی، یہ دھوپ، یہ طوفانِ گرد باد
ہم ان سبھی کے ساتھ ہی صحرا نشیں ہوئے

کچھ دوست جاں نثار تھے، جاں سے گزر گئے
کچھ دوست مثلِ مار، سرِ آستیں ہوئے

غم اس طرح ملے ہیں کہ خوشیوں میں ڈھل گئے
خوشیاں بھی یوں ملی ہیں کہ پھر سے حزیں ہوئے

ہم تو مسافروں کی طرح عمر بھر رہے
اک جا کبھی نہ ٹھہرے نہ اک جا مکیں ہوئے

میثم نقوی

غزل

وہ ڈر ہواؤں کا اب کے دلوں میں بیٹھ گیا
دیے بجھے تو دھواں طاقچوں میں بیٹھ گیا

میں ایسا خاک بسر تھا کہ تھک کے جب بیٹھا
غبارِ راہ مری جھڑیوں میں بیٹھ گیا

مرید مفلس و لاچار کی جگہ تھی یہی
برآمدے میں پڑی جوتیوں میں بیٹھ گیا

جو آیا تھا مرے سائے میں بیٹھنے کے لیے
ڈھلی جو دھوپ تو میری جڑوں میں بیٹھ گیا

تمھارا کرب سمجھتا ہوں میں اے دربدرو
مرا مکاں بھی گئی بارشوں میں بیٹھ گیا

میں قتل ہو گیا پہلے ہی سین میں سجاد
تو پھر سکوں سے تماشائیوں میں بیٹھ گیا

سجاد بلوچ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہاتھ سے لے نکل گئی، شور میں ضربِ ذات کے
ہم ہی تو گر تھے، ہم ہی سَم، زمزمۂ حیات کے

غزل

ہم سے تو وقت کے فرعون سنبھالے نہ گئے
تخت اُلٹے نہ گئے، تاج اُچھالے نہ گئے

کیسے اُس شوخ نے سوچوں سے نکالا ہم کو؟
ہم سے تو پاؤں کے کانٹے بھی نکالے نہ گئے

خامشی جب بڑی، زنجیر ہلا دی ہم نے
کیا ہُوا اگر لبِ اظہار سے تالے نہ گئے

عمر بھر جن کے نصیبوں میں مشقت ہی رہی
تا دمِ مرگ اُنہی ہاتھوں سے چھالے نہ گئے

زندگی میں ہی حسیں چاند جنھیں چھوڑ گئے
اُنہی چہروں سے کبھی درد کے ہالے نہ گئے

اہلِ فن، اہلِ جنوں کا کوئی ثانی نہ بدل
ہم سے سکے کسی ٹکسال میں ڈھالے نہ گئے

درد کی مکڑیاں بُنتی ہی رہیں کرب کے ساتھ
دل کے کمرے سے تیری یاد کے جالے نہ گئے

حشر تک روشنی دیتا رہا اک نورِ عقیل
قبر میں، آقاؐ! درودوں کے اُجالے نہ گئے

عقیل رحمانی

غزل

وہ گنبدِ فلک پہ ستارہ نما نہ تھے
سمجھے تھے رہنما جنہیں، وہ رہنما نہ تھے

وہ پھول کیسے کِھلتے سرِ شاخِ زندگی؟
جو فیضیابِ صُحبتِ بادِ صبا نہ تھے

یہ کیا ستم ہوا کہ بنایا جنہیں خدا
وہ ناخدائے وقت تھے، لیکن خدا نہ تھے

کس جُرم میں ملی یہ سزا ان کو منصفو؟
کیا فیصلے تمہارے یہ بے جا سزا نہ تھے؟

جو دوست مُجھ کو چھوڑ کے رستے میں چل دیئے
تھے تو اسیرِ جبر مگر بے وفا نہ تھے

”آن دست دست نیست کہ دستِ دعا نشد“
سینے پہ جتنے ہاتھ تھے، دستِ دعا نہ تھے

کُچھ لوگ نقشِ پا بنے صحرائے عشق میں
منزل کا ہم نشان تھے، ہم نقشِ پا نہ تھے

امن واماں ہے جعفری پیغامِ خرقہ پوش
اشعار میرے بُرِّشِ تیغِ جفا نہ تھے

اک شخص بھی شریکِ رہِ پُرخطر نہ تھا
یہ رہروانِ شوق مرے ہمنوا نہ تھے

گُلرنگ زخم سینے پہ تمغوں سے کم نہیں
کہتا ہے کون زخم یہ رنگیں قبا نہ تھے؟

وہ اور ہوں گے جن کو تھا تنکوں کا آسرا
ہم موجِ سیلِ تُند تھے، بے آسرا نہ تھے

مقصود جعفری

غزل

پیٹ خالی ہو تو مرغوب ہے چپٹی روٹی
اور بھرے پیٹ کو بھاتی نہیں تکہ بوٹی

وہ ہے رزاق ، عطا اس کی بقدرِ جثہ
اک چپاتی ہے بہت، کم ہے اک روٹی موٹی

جو بنا مانگے ہی پا جائے تو قسمت کا دھنی
اور مانگے سے نہ مل پائے تو قسمت کھوٹی

اک دعا دیر تلک مانگی ، ملا چھوٹا انعام
مل گیا اک بڑا انعام ، دعا تھی چھوٹی

قوم بکھری ہے جو اعجاز سنبھل جائے گی
اک گڈریا ملے، ہو ہاتھ میں جس کے سوٹی

اجمل اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شہرِ عمل میں بھاگتے لمحوں کے ساتھ بھاگ
خالد حصارِ فکر سے باہر نکل کے آ

غزل

جو زخم بور اُٹھانے لگا تو دیکھیں گے
ہمارا عشق ٹھکانے لگا تو دیکھیں گے

ابھی تو ٹیسیں ہیں مدھم سی کیف آور سی
جو درد، نیر بہانے لگا تو دیکھیں گے

ہیں خوب شیر و شکر اور گاڑھی چھنتی ہے
وہ راز ہم سے چھپانے لگا تو دیکھیں گے

ہمارے دل میں وہ اپنی جگہ بناتا ہے
ہمیں وہ اپنا بنانے لگا تو دیکھیں گے

ابھی تو آنکھوں سے میٹھے کلام کرتا ہے
مراسم اور بڑھانے لگا تو دیکھیں گے

افق کے پار رضا چاند مسکراتا ہے
وہ چشمِ خواب میں آنے لگا تو دیکھیں گے

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

عشق کا فخر نہیں، یکسر و یکتا ہونا
عشق ہے سب سے الگ ہو کے بھی سب سا ہونا

غزل

روان بہ ہم ، بہ جُو ، بہ شط
شکارے ، آب ، شام ، بط

نمو ، نمو ، نمو ، نمو !!
فقط ، فقط ، فقط ، فقط ؟؟

نکال زاویہ مرا
یہاں سے قط ، وہاں سے قط

شکستہ گھونسلہ اُٹھائیے
درخت میں نہیں سکت

ملا؟ نہیں نہیں! ملا
وہ خط، وہ خط، وہ خط، وہ خط

وہ کاٹتا گیا مجھے
غلط غلط غلط غلط

ہمارا مسئلہ ہے تُو
نہ کوئی چھت نہ کوئی پَت

وہ ایک دن گزر گیا
نگاہ ڈال کر غلط

منظر اعجاز منظر

غزل

ترے دیار کی جانب سفر کیا میں نے
یہ ایک کام تھا جو عمر بھر کیا میں نے

نظر کے سامنے دیوار ہی کچھ ایسی تھی
کہ سنگ و خشت میں دستک سے در کیا میں نے

اڑائے پھرتی ہے مجھ کو جو ایک مدت سے
بسیرا روز اسی خاک پر کیا میں نے

خدا ہی جانے مرے پاؤں کس نے روک لیے
کسی سفر کا ارادہ اگر کیا میں نے

کہیں قیام کی صورت نظر نہیں آئی
خود اپنے جسم کی مٹی کو گھر کیا میں نے

یہ جس کے سائے میں بیٹھے ہو تم خبر بھی ہے
اس ایک شاخ کو کیسے شجر کیا میں نے

کسی دیے کی نہیں اب طلب رہی مجھ کو
تمہاری یاد کو اپنا قمر کیا میں نے

تمام عمر ہی یہ راز کھل نہیں پایا
میں بے اثر تھا کہاں پر اثر کیا میں نے

محبتوں کے زمانوں کا راستہ جاناں
تلاش سارا جہاں چھوڑ کر کیا میں نے

کسی کے آنے کی آہٹ ہوا میں تھی اعظم
سو انتظار سرِ رہگزر کیا میں نے

اعظم کمال

غزل

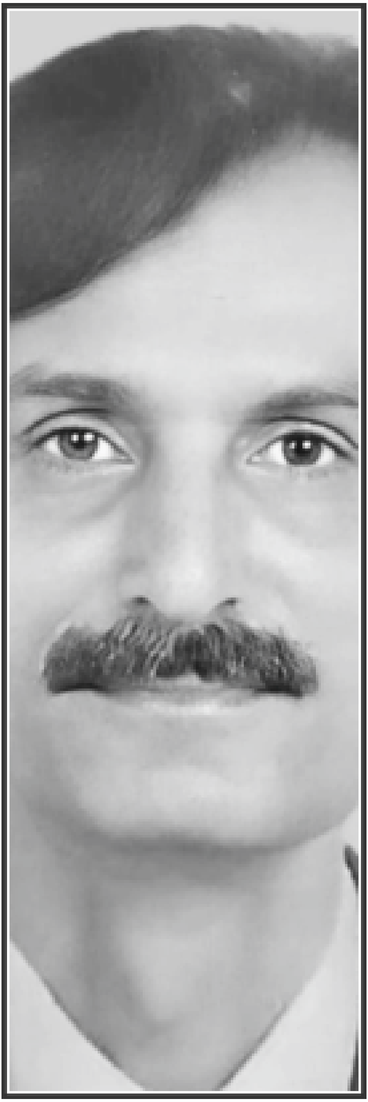

مظہر امام

مجھ پہ واجب تھا نصابوں کی طرح
اس کو پڑھتا تھا کتابوں کی طرح

میں بھی شامل تھا تری راتوں میں
موتیے اور گلابوں کی طرح

دیکھ کر اس کو ہوئی تھی حیرت
ہو بہو تھا میرے خوابوں کی طرح

ٹوٹ جاتے تو بھلا بھی دیتا
خواب نکلے ہیں سرابوں کی طرح

دیکھ لیتا ہوں مگر چھپ چھپ کر
میں تجھے تیرے حجابوں کی طرح

دوستی اس سے نہیں ہو سکتی
وہ نہیں خانہ خرابوں کی طرح

میں امام ایسے نہیں پی سکتا
آبِ زم زم کو شرابوں کی طرح

غزلیں

کسی کسی کی خوشی کی اساس دنیا ہے
کسی کسی کو مرے دوست! راس دنیا ہے

چھپی ہوئی ہے اگرچہ ہزار پرتوں میں
فقیر کہتا پھرے بے لباس دنیا ہے

ہزارہا انہیں محرومِ حق دکھائی نہ دیں
جو کہہ رہے ہیں کہ جوہر شناس دنیا ہے

جہاں کا روندا ہوا پیار میں پناہ گزیں
محبتوں سے شکستہ کی آس دنیا ہے

ہم اختتامِ سفر سے قیاس کرتے ہیں
غبار، رنج، تھکن اور پیاس دنیا ہے

کچھ ایسا ردِعمل تھا مری تباہی پر
مجھے لگا کہ بہت بدحواس دنیا ہے

بہلتا کیف و نشاطِ جہاں سے کیا جاذب
اداس دل کے لیے تو اداس دنیا ہے

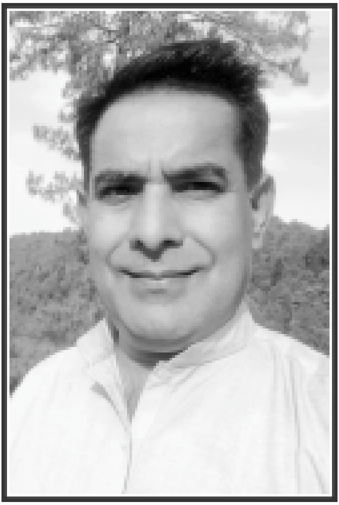

اکرم جاذب

جب رتیں آ کے چلی جائیں محبت والی
ایک تصویر بنا دیتی ہیں حیرت والی

ہندسوں کا تو نہیں ہوتا ہے میزانیہ پیار
جمع تفریق نہیں چلتی تجارت والی

بارہا ہاتھ جلائے گئے انگاروں سے
اپنی عادت نہیں بدلی کبھی عجلت والی

آپ کے لفظوں کو تائید نہیں آنکھوں کی
بات کرتے ہوئے تجدیدِ رفاقت والی

کیوں نہ اشعار کسی یار کو دے دیں جاذب
اپنے ہاتھوں میں تو ریکھا نہیں شہرت والی

غزل

جس نے ہر لحظہ محبت کے ہیں جگنو پالے
اس کے جیون میں اندھیرے نہیں ہونے والے

منتظر کب سے ترے چاک پہ بیٹھا ہوا ہوں
اب تری مرضی ہے جس شکل میں مجھ کو ڈھالے

تو تو ہر دور میں سچائی کا پرچارک تھا
تیرے ہونٹوں پہ بتا کس نے ہیں تالے ڈالے

کوئی منظر بھی نہیں صاف دکھائی دیتا
جس طرف دیکھیں نظر آتے ہیں جالے جالے

میں محبت کا پجاری ہوں وفاؤں کا اسیر
شوق سے جو بھی چلا آئے مجھے اپنا لے

میں نے بجھنے نہیں دی پیار کی چنگاری وہ
اس سے کہنا کہ کبھی آئے اسے بھڑکا لے

کب تلک سامنا کرتا رہوں محشر کا جلیل
کوئی تو آئے خدارا یہ قیامت ٹالے

احمد جلیل

غزل

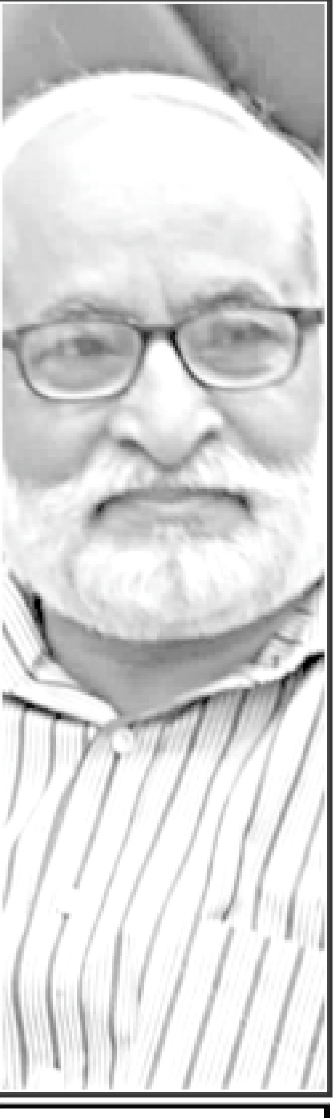

بارشوں میں اور بھڑکی ہجر کے لمحوں کی آنچ
کر گئی ہے راکھ نیندیں وصل کے خوابوں کی آنچ

آگ سانسوں میں لگی اور دل تڑپ کر رہ گیا
جب مری آنکھوں میں اُتری بھیگتے جسموں کی آنچ

یہ ہے اِک شعلہ بدن کے لمس کی جادوگری
رات بھر سونے نہیں دیتی مجھے جذبوں کی آنچ

اُس کی سانسیں جب مری سانسوں میں شامل ہو گئیں
جسم کو گرما گئی جلتی ہوئی سانسوں کی آنچ

جذبۂ انسانیت کو موت کیسے آ گئی
کیسے بھڑکی ہے مری ملت میں یہ طبقوں کی آنچ

خاک ہو جاتے ہیں جل کر خاک میں شاہ و گدا
ہر تکبر کو مٹا دیتی ہے جب قبروں کی آنچ

اہلِ دانش کے دلوں میں جذبۂ احساس کو
زندگی بھر زندہ رکھتی ہے سحر رشتوں کی آنچ

اکرم سحر فارانی

غزلیں

بس محبت میں ترا ہجر کمایا ہوا ہے
اور اس ہجر کو آنگن میں اُگایا ہوا ہے

تو جسے دشت سمجھتا ہے یہ اب دشت نہیں
میں نے اس دشت میں اک شہر بسایا ہوا ہے

یہ جو اک روشنی پہلو سے مرے پھوٹتی ہے
یہ وہی زخم ہے جو تو نے اُگایا ہوا ہے

آنکھ سورج سے ملاتے ہوئے کتراتا ہوں
میں نے آنکھوں میں کوئی چاند بسایا ہوا ہے

وہ محبت کا وہی گیت سناتا ہے مجھے
میں نے اوصاف جو لوگوں کو سکھایا ہوا ہے

اوصاف شیخ

ٹوٹ کر بکھرے ہیں سپنے صحن میں
کس نے کھینچے ہیں یہ رستے صحن میں

کون دیتا ہے اداسی کو فریب
کون اگاتا ہے یہ چہرے صحن میں

کوئی سمجھا ہی نہیں اک لفظ بھی
گونجتے ہیں کتنے لہجے صحن میں

اک شجر بھی نام کو گھر میں نہیں
اڑ رہے ہیں خشک پتے صحن میں

جانے کب ٹوٹے طلسمِ تیرگی
جانے کب اتریں سویرے صحن میں

چھوڑ جاتا ہے کوئی آنکھیں یہاں
کھول جاتا ہے دریچے صحن میں

رات پھر اوصاف یاد آیا کوئی
رات جیسے پھول مہکے صحن میں

غزل

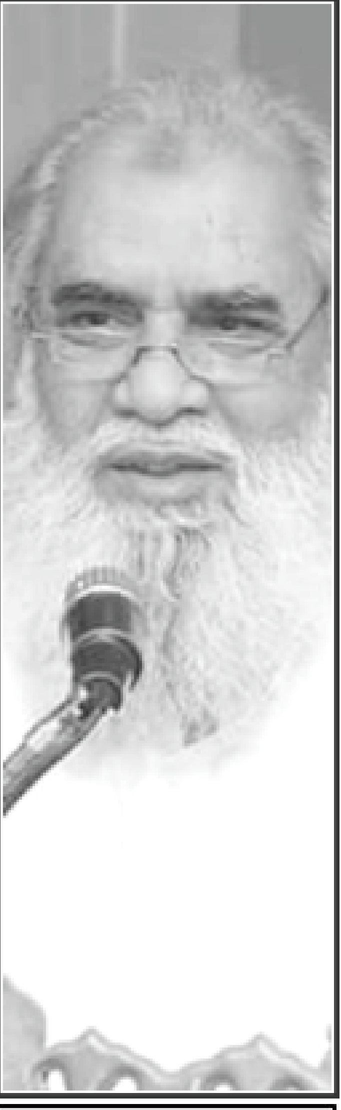

کام جو ہونا ہوں ہر حال میں ہو جاتے ہیں
سونے والے تو میاں سولی پہ سو جاتے ہیں

صبح اگتا ہے مرے سامنے سورج جس کو
شام گھر جاتے ہوئے کھیت میں بو جاتے ہیں

اک زمانہ تھا کہ میں شعر کہا کرتا تھا
آج کل شعر نہیں کہتا میں، ہو جاتے ہیں

یاد ہے راوی کنارے ہے محبت کا مزار
جب بہار آتی ہے واں اشک پرو جاتے ہیں

ماں تری گود میں سر رکھ کے وہ سونے والے
جلتی دوپہر میں اب کھیت میں سو جاتے ہیں

شعر کہتے ہوئے اکثر ہی یہ شاعر حضرات
انگلیاں خون میں اپنے ہی ڈبو جاتے ہیں

جانے کیا بات ہے کیوں حضرتِ اکرم ناصر
بیٹھے بیٹھے ہی کسی خواب میں کھو جاتے ہیں

اکرم ناصر

غزل [نذرِ میر]

وہ جو دل کے مکاں سے اٹھتا ہے
میرے وہم و گماں سے اٹھتا ہے

جس جگہ بیٹھ کر سنورتے ہیں
کون آخر وہاں سے اٹھتا ہے

کھنچتی ہے کدھر کی خاک مجھے
میرا پیکر کہاں سے اٹھتا ہے

کتنے منظر بکھرنے لگتے ہیں
جب کوئی درمیاں سے اٹھتا ہے

دیکھنے دو جمالِ یار کی سمت
کون اس آستاں سے اٹھتا ہے

اے مورخ نکال دکھ سے مجھے
دل تری داستاں سے اٹھتا ہے

اس زمیں پر دوام ہے کس کو
کون پہلے یہاں سے اٹھتا ہے

ٹوٹنے کی اگر صدا ہی نہیں
شور اتنا کہاں سے اٹھتا ہے

سونے والا ہے موت کی زد پر
کب وہ آہ و فغاں سے اٹھتا ہے

یہ مسیحا کہاں سے آتے ہیں
زخم کیسے نشاں سے اُٹھتا ہے

ذوقِ پرواز ہے پرندے میں
ورنہ کب آشیاں سے اٹھتا ہے

خیر کے رنگ پھیل جاتے ہیں
بیٹھ کر وہ جہاں سے اٹھتا ہے

دوستی رکھ مخالفین کے ساتھ
کیوں صفِ دشمناں سے اٹھتا ہے

جانے کیوں رات دن الاؤ سا
خیمۂ جسم و جاں سے اٹھتا ہے

آخرِ کار اعتبار نوید
حلقۂ دوستاں سے اٹھتا ہے

محمد نوید مرزا

غزل

خواب کو جب خیال میں دیکھا
ہم نے اس خوش جمال میں دیکھا

چاند چھپتا چھپاتا آ نکلا
تیری زلفوں کے جال میں دیکھا

ایک صورت بھی کیا نظر آئی
ایک عالم مثال میں دیکھا

حسن کا کیا حسیں کرشمہ تھا
جو ترے خد و خال میں دیکھا

حسن کی کوئی حد نہیں پھر بھی
حسن اپنے کمال میں دیکھا

وقتِ رخصت جو کھو گیا لمحہ
لمحہ ہائے وصال میں دیکھا

حسن خوشبو میں حسن میں خوشبو
یہ اسی خوش خصال میں دیکھا

حسن ہو اور وفا بھی ہو باہم
یہ کہیں خال خال میں دیکھا

وہی آہنگ جیسے محوِ خرام
ہرنیوں کی جو چال میں دیکھا

وہ شبِ تار کا اندھیرا تھا
جو ترے بال بال میں دیکھا

راجہ عبدالقیوم

غزل

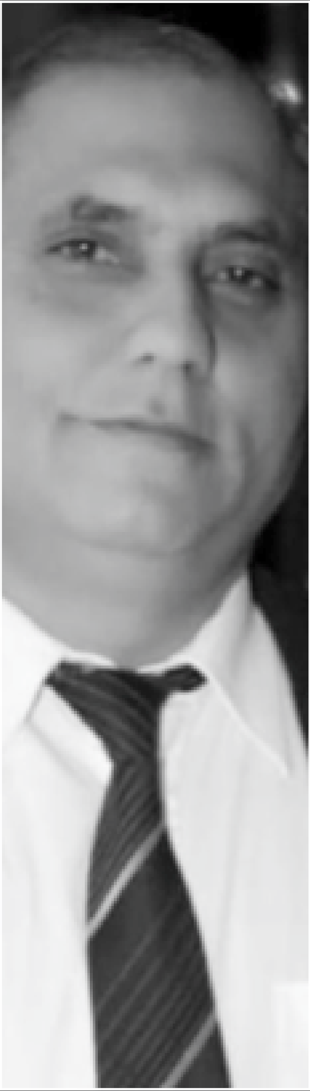

ڈرتے نہیں ہیں دھوپ سے کچھ یوں بھی سخت ہیں
ہم لوگ اپنے اپنے گھروں کے درخت ہیں

ترتیب ہی لگانے میں گزری ہے ساری عمر
اس زندگی کے سارے ورق لخت لخت ہیں

تسبیح کی ہے ایک ہی چہرے کی عمر بھر
ہم بارگاہِ عشق میں یکتا پرست ہیں

کیسے کریں معاملہ کبر و یقین سے
ہم تو اجل کے ہاتھ سے بس ایک جست ہیں

گرد و غبارِ دنیا سے میلے نہیں ہوئے
ہم حجرۂ خیال میں مست و الست ہیں

ان سے مقابلہ نہیں بنتا کسی طرح
جتنے حریف ہیں مرے بونے ہیں پست ہیں

عرفان میرے شہر کے لوگوں کو کیا ہوا
آنکھیں ہیں شعلہ بار تو لہجے کرخت ہیں

عرفان صادق

غزل

بس ایک لمحہ مری نظر سے نظر ملائے تو جان حاضر
وہ کچھ نہ بولے مگر ذرا سا جو مسکرائے تو جان حاضر

بزورِ ابرو وہ جیسے چاہے خوشی سے کھیلے ہماری جاں سے
نظر جھکائے تو جان جائے نظر اٹھائے تو جان حاضر

کلیم جیسے ہی خواب و خواہش ہم اپنے دل میں لیے ہوئے ہیں
ہماری خاطر نقاب پھر سے اگر اٹھائے تو جان حاضر

یہ دل میں ہے جو غبار سارا، ہے ایک بوسے کی مار سارا
وہ لوٹ کر دل ہمارے دل سے اگر لگائے تو جان حاضر

عجیب آداب و اجنبیت کے فاصلوں پر رکھا ہوا ہے
صغیر میرا وہ نام لے کر مجھے بلائے تو جان حاضر

صغیر احمد صغیر

مجھ سے طلوعِ صبح کے منظر چھپا گئی
ٹھنڈی ہوا چلی تو مجھے نیند آ گئی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غزل

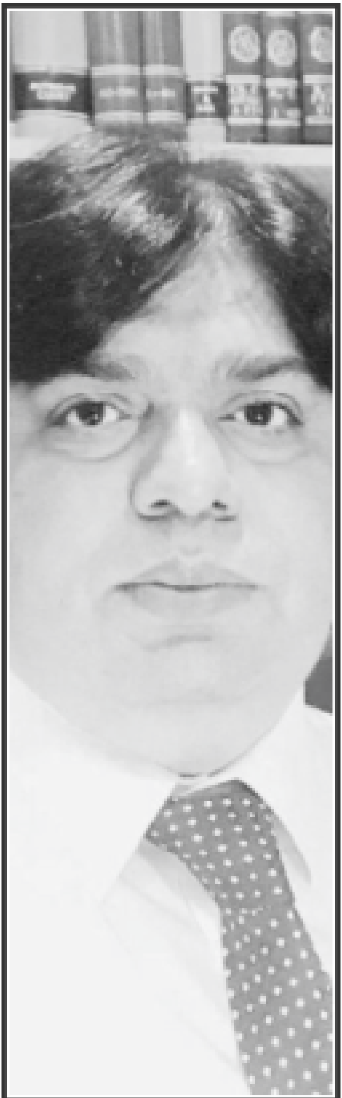

آنسو دیکھا ہے کئی بار ستارا کر کے
نفع اس کام میں ہوتا ہے خسارا کر کے

اس کے بارے میں کسی اور سے پوچھو جا کر
ہم نے دیکھا ہی نہیں پیار دوبارہ کر کے

روز و شب میرے گذرتے ہیں اسے ڈھونڈنے میں
کوئی چھپ جاتا ہے اک بار اشارا کر کے

ہم فقط دیپ جلاتے ہیں لحد پر جا کر
چھین لیتا ہے خدا سب کو ہمارا کر کے

حال گر پوچھنا ہو تو مرا خود سے پوچھو
خود کو میں بھول گیا کب کا تمہارا کر کے

اس کا انجام خدا جانے ہوا کیا شوکت
خواب کو بیٹھ گیا میں تو سہارا کر کے

افتخار شوکت

غزل

دریا پربت جنگل صحرا تیرے نام
ہر اک منظر میں نے لکھا تیرے نام

لوحِ دل پر جو ہیں یادیں بچپن کی
کاغذ کشتی کھیل تماشا تیرے نام

لب کی جنبش لمس سرکتے ہاتھوں کا
دل کی دھڑکن، چشمِ بینا تیرے نام

تُو جو اک پل جیون مجھ کو دان کرے
میں تو کر دوں یار زمانہ تیرے نام

روپ نگر میں رہنے والی شہزادی
عشق نگر کا ہر اک رستہ تیرے نام

میری نظمیں تیرے روپ کا پرتو ہیں
میری غزلیں ہر اک مصرع تیرے نام

سانسوں کے سندور سے تیری مانگ بھروں
کر دوں اپنے دل کا سرمہ تیرے نام

تختِ شاہی مجھ کو بھی گر مل جاتا
تاج محل کا ہوتا نقشہ تیرے نام

میں نے ہر اک لفظ میں تجھ کو برتا ہے
درد میں ڈوبا میرا لہجہ تیرے نام

میری سوچ کا محور تیرا پیکر ہے
میری آنکھ کا ہر اک سپنا تیرے نام

ساگر لہریں کشتی تجھ پر واروں میں
ساحل کا ہر ایک نظارہ تیرے نام

تتلی، جگنو، بادِ صبا کی اٹھکیلی
کوئل، کوکو اور پپیہا تیرے نام

رم جھم بارش، دھول اُڑاتی تنہائی
میرے کمرے کا ہر کونا تیرے نام

تجھ سے مجھ کو بانہوں کا جو ہار ملے
کردوں اپنے دل کا کوکا تیرے نام

پھول پرندے، باغوں کی سب رعنائی
جھرنے، ندیا، میٹھا چشمہ تیرے نام

تجھ پر ہر اک گہنا جچنے لگتا ہے
پیتل، کانسی، چاندی، سونا تیرے نام

برکھا رُت میں ہاتھوں میں گر ہاتھ رہے
جل تھل بارش قطرہ قطرہ تیرے نام

آدھا جیون ارشد نے تو ہار دیا
جو کچھ بھی اب پاس ہے سارا تیرے نام

ارشد محمود ارشد

غزل

ہو گئے ہیں اس قدر بیمار سے
غم چھلکتا ہے در و دیوار سے

ہم نے اپنایا سبھی کو پیار سے
دل نہیں جیتے کبھی تلوار سے

شوق سے لے کر گئے تھے خواہشیں
لوٹے ہیں مایوس ہم بازار سے

رقص کرنے لگ گیا سارا وجود
کھل اٹھا دل جب ترے دیدار سے

باخبر رہنا ہے تو چہروں کو پڑھ
سچ کہاں مل پائے گا اخبار سے

سچ بتاؤ بات دل کی پیار میں
جھوٹ مت بولو کبھی دلدار سے

حق تم اپنا چھین لو افضل مگر
بھیک مت مانگو کسی زردار سے

افضل ہزاروی

غزل

اب ہونے لگا ہے شک کہیں پر
اے دل ! تُو ذرا دھڑک کہیں پر

آواز اُسی کی ہے مگر وہ
نزدیک نہ دُور تک کہیں پر

اِس آس پہ گھر سے چل پڑا ہوں
مل جائے گی وہ سڑک کہیں پر

موجود اگرچہ میں یہیں ہوں
دروازے کی ہے کھٹک کہیں پر

آنکھیں بھی اُداس ہو گئی ہیں
دیکھی نہ تری جھلک کہیں پر

اک خواب ظہور ہو رہا ہے
اے اشکِ رواں ! چمک کہیں پر

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سرِ حیات اک الزام دھر گئے ہم بھی
کلام بھی جیا اور مر گئے ہم بھی

غزلیں

ہر پل اسی کے واسطے لب پر دعائیں ہیں
سینے میں دفن آج بھی جس کی وفائیں ہیں

اقدار، میرے شہر کے زندہ ہیں آج بھی
سانجھے ہیں درد، سانجھی خوشی کی ردائیں ہیں

یارب! اسیرِ راہِ محبت کی خیر ہو
اس راہِ پُر خطر میں تو ہر سو بلائیں ہیں

آثار، قربِ حشر کے ظاہر ہوئے ہیں یوں
بے نور مہر و مہ ہیں، مکدر فضائیں ہیں

اس دورِ فتنہ خیز میں مہدی کا ہو ظہور
دنیا میں جب عروج پہ ہر سو جفائیں ہیں

گرچہ قریبِ مرگ ہیں بوڑھے سماج کے
لیکن، جوان آج بھی ان کی انائیں ہیں

شوکت محمود شوکت

عشق تھا، دورِ جنوں تھا، رت جگے بھی خوب تھے
زیرِ پائے شوقِ شوکت، آبلے بھی خوب تھے

دونوں جانب جب فزوں تھی، لذتِ سوزِ فراق
تیرے میرے درمیاں وہ فاصلے بھی خوب تھے

مل نہ پائی منزلِ مقصود لیکن، یاد ہیں
جن میں ہم بھٹکے پھرے، وہ راستے بھی خوب تھے

سامنے کھاتے تھے، میری دوستی کی جو قسم
دشمنوں سے ان کے مخفی، رابطے بھی خوب تھے

آج بھی محظوظ ہوتے ہیں انھی زخموں سے ہم
عشق میں گزرے جو دل پر، حادثے بھی خوب تھے

نسلِ نو کو بھی ہوا احساس اب اس بات کا
جو کہ پرکھوں نے کیے تھے، فیصلے بھی خوب تھے

خوب تھیں صیاد کی چالیں بھی شوکت، خوب تھیں
طائرِ کنجِ قفس کے حوصلے بھی خوب تھے

غزلیں

اس محفلِ بے رنگ کے دن رات بدلتے
سازندے نئے آتے تو نغمات بدلتے

نایاب سکوں دل کا ابھی دورِ جنوں ہے
کیا عمر لگا کرتی ہے جذبات بدلتے

ہاں صاحبِ کردار بدلتے نہیں لیکن
کچھ لوگ بدل جاتے ہیں اوقات بدلتے

جا اُن سے ذرا پوچھ نئے دن کی کہانی
جو خون جلا آئے سیہ رات بدلتے

اس عہد سے لپٹی ہے وہ صدیوں کی جہالت
کیا رنگ جنوں لاتا خیالات بدلتے

تصویر کے دو رخ ہیں امیری و فقیری
دو لمحے لگا کرتے ہیں حالات بدلتے

اُس شوخ کو بس دل کے لیے دل ہی دیا تھا
ہم دل کے سوا کونسی سوغات بدلتے

ناظر ترے منظر میں اگر کچھ نہیں بدلا
کیا ذہن میں موجود سوالات بدلتے

اقبال ناظر

الفت سے التفات سے آگے نکل گئے
دل رسمِ واردات سے آگے نکل گئے

اک لو سے مات دے گئے شب کی بساط کو
جگنو سیاہ رات سے آگے نکل گئے

ہم کھیلتے رہے ہیں روایت کے ساز سے
بچے قلم دوات سے آگے نکل گئے

کچھ لوگ اپنی ذات کے افسوں میں قید تھے
کچھ لوگ اپنی ذات سے آگے نکل گئے

منظر نیا ہے سامنے بے نام ہی سہی
ہم رازِ شش جہات سے آگے نکل گئے

ہم کھینچتے ہی رہ گئے اپنی کمان کو
دشمن ہماری گھات سے آگے نکل گئے

ناظر بجز دماغ کوئی کام آئے گا
اس زعمِ بے ثبات سے آگے نکل گئے

غزل

خواب آنکھوں کے پار بیٹھے ہیں
شب بھی اپنی گزار بیٹھے ہیں

ہم ستاروں کے عشق میں سیو
اپنا صدقہ اتار بیٹھے ہیں

ایک حسرت تھی ، ہو گئی پوری
ایک جیون تھا ، ہار بیٹھے ہیں

دل پہ قابو رہا نہیں کوئی
اِس لیے بے قرار بیٹھے ہیں

دن نکلتا نظر نہیں آتا
گیسوؤں کو سنوار بیٹھے ہیں

اپنا جانِ بہار آئے گا
کر کے سولہ سنگھار بیٹھے ہیں

کوئی پوچھے تو ہم بھی بتلائیں
کیوں سرِ رہ گزار بیٹھے ہیں

مابدولت بیا اگر دیکھے
پالکی میں سوار بیٹھے ہیں

بیا جی

غزلیں

چاند جیسا آسماں پر ہے وہ پانی میں نہیں
لفظ میں جو لطف ہے اس کے معانی میں نہیں

عمر آدھی سے زیادہ کاٹ کر اس موڑ پر
میں نے یہ جانا کہ میں اس کی کہانی میں نہیں

ابر اور آنسو کا کیا؟ آ جائیں بے موسم کہیں
آج کل دریا مگر اپنی روانی میں نہیں

منزلوں کو کھوجنے میں وقت کچھ درکار ہے
ایسا کچھ امکان لیکن لامکانی میں نہیں

دیکھنے میں بچپنے کی بات رخشندہ لگے
عشق ڈھلتی عمر میں ہونا جوانی میں نہیں

رخشندہ نوید

پھیکا، پھیکا مرے چہرے پہ وہی رنگ سا ہے
اتنا آرام میسر ہے کہ دل تنگ سا ہے

میں نے آنکھوں کو کئی روز سے موندا ہی نہیں
شاخ پر ایک پرندہ بھی بہت دنگ سا ہے

اس قدر شہر خموشاں میں ہے اس بار ہجوم
شور ایسا کہ سراسر جو کسی جنگ سا ہے

کیسے طے ہوگا سفر پھر اسی رفتار کے ساتھ
پاؤں میں اپنے بندھا جیسے کوئی سنگ سا ہے

ہم کو اک وہم سا رہتا ہے کہ تکیے پہ کہیں
ایک دستک ہے کہ آہٹ ہے کہ آہنگ سا ہے

ایک یہ دل ہے کہ ترتیب میں آتا ہی نہیں
ایک اظہار محبت ہے جو بے ڈھنگ سا ہے

اس کے سینے میں تمھارے لیے، رخشندہ نوید!
اک کدورت ہی نہیں اس میں بہت زنگ سا ہے

غزل

ثمینہ سیّد

مکین دل میں ہے اب تک وہ شام...... یاد ہے ناں
بس ایک دوجے کا لیتے تھے نام...... یاد ہے ناں

ہجوم چاروں طرف تھا جہاں رقیبوں کا
وہاں پہ کیسے کیا تھا سلام...... یاد ہے ناں

مرے لیے تو فقط تم ہی خاص تھے، ورنہ
گلی نہیں تھی کوئی راہِ عام...... یاد ہے ناں

زہے نصیب، مجھے مفت میں ملا ہے کہ تُو
ترے حصول کو لگتے تھے دام یاد ہے ناں

دھڑکتے سینے تھے ہونٹوں پہ مہر چسپاں تھی
کیا تھا آنکھوں نے سارا کلام...... یاد ہے ناں

پیام میرا، ثمینہ تھا نامہ بر میں تھی
غزل کی شکل تھا میرا پیام...... یاد ہے ناں

انتخاب

خالد احمد

بند دروازہ تھا خالد، یا عبادت گاہ تھی
اس کے در پر سارے بے کس، سارے بے گھر سو گئے

نعمان منظور

غزل

اندھیرے دور کروں گا مراد پاتے ہوئے
دعائیں مانگ رہا ہوں دیے جلاتے ہوئے

کسی کی یاد نے جکڑے رکھا یقین کے ساتھ
ارادہ ٹوٹنے والا تھا ڈگمگاتے ہوئے

نکل نہ پایا نظر کی کشش کے ہالے سے
دکھائی دیتا رہا چاند آتے، جاتے ہوئے

سکون دیتے ہیں وحشتِ فراق میں بھی مجھے
دیارِ حسن سے سانسوں کے سوت کاتے ہوئے

لکھا تھا جو بھی مقدر میں، وہ قبول کیا
خلوصِ دل سے، محبت سے، مسکراتے ہوئے

کسی کی سوچ نے بانہوں میں بھر لیا ہے مجھے
بلا ارادہ مرا شعر گنگناتے ہوئے

شمولیت کے دیے جل اٹھے لگا ہوں میں
پگھل گیا وہ مرا، شوق آزماتے ہوئے

غبار چھوڑ گیا پیچھے اپنی یادوں کا
گزر گیا ہے کوئی دل سے دندناتے ہوئے

پلٹ، پلٹ کے اسے دیکھتے ہوئے آکاش
ملال بڑھنے لگا دل میں لوٹ آتے ہوئے

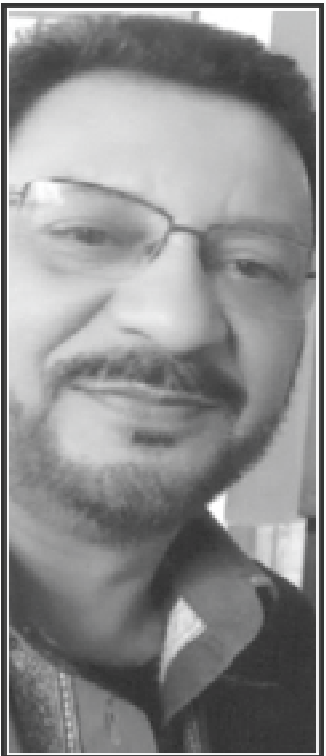

احمد سبحانی آکاش

غزلیں

کیا مصلحت تھی اس میں کہ جانے نہیں دیا
پھر دشمنوں سے ہاتھ ملانے نہیں دیا

دیکھا اسے تو دیر تلک غم زدہ رہے
آنکھوں کو لیکن اشک بہانے نہیں دیا

بھولے تو پھر خیال وہیں لے کے آ گیا
سچ ہے کسی نے تم کو بھلانے نہیں دیا

چہرے کے پیچھے چہرا چھپاتے ہیں کس طرح
"اتنا کمال ہم کو خدا نے نہیں دیا"

دل بدگماں تھا اور نہ حائل انا ہی تھی
کیا بات تھی کہ جس نے نبھانے نہیں دیا

الجھا کچھ اس طرح کہ الجھتا چلا گیا
پھر اتنا وقت تو نے زمانے نہیں دیا

چاہت کے جیسی تیری عداوت تھی مستقل
روٹھا تو پھر کبھی بھی منانے نہیں دیا

نائلہ راٹھور

بصیرت آنکھ کی طالب بنی ہے
وگرنہ جو بھی ہے حرف جلی ہے

دیے نے اور بھی ہے جان پکڑی
ہوا چاہے مخالف ہی چلی ہے

تصوّر نام ہے اُس سرزمیں کا
جہاں محبوب کی میرے گلی ہے

خموشی نسبتوں کو دان کر دو
تکلم کے لیے دنیا پڑی ہے

یقیناً دھول میں رستہ اٹا ہے
نظر تو کام اپنا کر رہی ہے

نصیحت کرتے ہیں اک دوسرے کو
مخالف آدمی کا آدمی ہے

ردا حاصل خلوص

غزل

محمد اشرف کمال

جو ستارے کبھی آنکھوں سے اٹھائے گئے تھے
لہو روتے ہوئے مٹی میں بچھائے گئے تھے

آنکھ میں ٹوٹے ہوئے کانچ کے ٹکڑوں سے ہیں
ہائے وہ لوگ جو خوابوں میں بسائے گئے تھے

اپنی تکمیل کو پہنچے ہی نہیں ہیں اب تک
جانے ہم کونسی مٹی سے بنائے گئے تھے

اس قدر خوف تھا باتوں کا ہماری کہ نہ پوچھ
ہم زباں کاٹ کے دربار میں لائے گئے تھے

اس زمیں پر جو ہمیں بھیجا گیا تھا تو ہم
آسمانوں کی زمینوں سے اٹھائے گئے تھے

رستہ ہموار انھوں نے ہی کیا سورج کا
کئی جگنو جو اندھیرے میں جلائے گئے تھے

صرف بندوق یا تلوار ہی ہتھیار نہ تھے
سیکڑوں لفظ تھے جو تیر بنائے گئے تھے

غزل

ذرا سا چھٹنے لگا ہے غبار کا موسم
بدل چلا ہے دلِ سوگوار کا موسم

مری بلا سے ہو اب گُل کہ خار کا موسم
یہاں وہی ہے جو ہے کوئے یار کا موسم

پڑے ہیں جھولے، ہے رم جھم پھوار کا موسم
ترے بغیر اُدھورا سنگھار کا موسم

ہر ایک روز ہے شہرِ نگار کا موسم
کبھی نہ ٹھہرا یہاں اعتبار کا موسم

پنپ سکے بھی تو کیوں برگ و بار کا موسم
ابھی تو اوج پہ ہے طوق و دار کا موسم

خزاں کی زد پہ ہے جاہ و وقار کا موسم
ہمیشہ رہتا نہیں ہے بہار کا موسم

وہ اِک صدا جو کہیں دور سے سنائی دی
بدل کے رہ گیا قرب و جوار کا موسم

وہ ایک لمحہ کہ جس پر گمان جیت کا تھا
وہیں سے ساتھ چلا اپنی ہار کا موسم

برستی بوندوں میں رم جھم گذشتہ لمحوں کی
کبھی نہ بھول سکا وہ خمار کا موسم

تمھارے ساتھ ہی شاید تمھیں نہیں معلوم
خیال و خواب ہُوا ہے قرار کا موسم

خزاں کے دور میں اُتری دھنک بہاروں کی
کبھی نہ پھیکا پڑا یادِ یار کا موسم

ہزار رنگ رُتیں آئیں اور چلی بھی گئیں
رُکا ہوا ہے مگر انتظار کا موسم

میں زندگی کے لیے تیرا ساتھ لے لوں گی
جو ہاتھ آیا کبھی اختیار کا موسم

عذاب کتنے سہے، اب تو یہ بھی یاد نہیں
گزر چکا ہے حساب و شمار کا موسم

خالدہ انور

غزل

مِلا ہو کھوٹ جہاں دل میں، زرگری نہ سمجھ
ہر التفاتِ نظر کو، تُو دلبری نہ سمجھ

اُتر گیا ہے ترا حُسن دل کے پار کہیں
سو، یہ نگاہِ گرفتار سرسری نہ سمجھ

کیے ہی جاؤں مُسلسل طوافِ حسن مگر
مری وفا کی عقیدت کو نوکری نہ سمجھ

پھر اک بہار کا جھونکا اِدھر بھی آئے گا
یہ دل کی شاخِ تمنّا ابھی ہری نہ سمجھ

سمٹ گیا ہے نئے روپ میں ہر ایک وجود
نہا کے جَل سے جو نکلی ہو، جل پری نہ سمجھ

جمیل زادی خُراسان سے بھی گر آئے
تو اُس کے حسن کے جادو کو سامری نہ سمجھ

ذرا بھی تَر نہ ہوئے تشنگی کے ہونٹ ابھی
اے ساقیا! یہ صراحی بھری بھری نہ سمجھ

کہیں سے آب تو دریا کے حلق میں اُترے
یہاں ہے چارسُو خشکی، اِسے تری نہ سمجھ

صلیبِ وقت اُٹھانی پڑے گی کاندھوں پر
یہ اپنا غم ہے کِسی کی برابری نہ سمجھ

تجھے معاف کیا ہے تو یہ بڑا پن ہے
کِسی کا ظرفِ کشادہ، سکندری نہ سمجھ

انھیں تو اور ضرورت ہے کچھ نوابوں کی
ذرا سی بُھوک مٹی ہے، تونگری نہ سمجھ

پڑے ہوئے ہوں اگر جھولیوں میں سکے بھی
ہر آدمی کو مگر درد سے بَری نہ سمجھ

اُجاغ میں جو پڑی راکھ، آفتاب نے دی
کتابِ دل ہے، اِسے تُزک بابری نہ سمجھ

لہو جگر کا پلاتا ہے آفتاب اسے
تو اِس جدید غزل کو، غزل گری نہ سمجھ

آفتاب خان

غزل

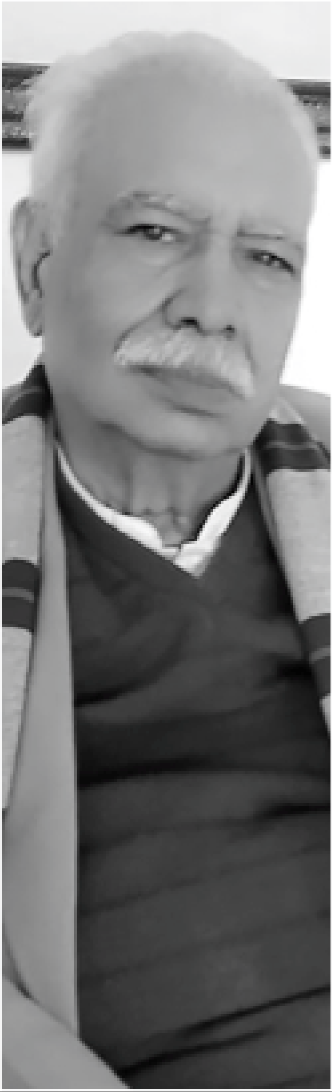

میں تو اکثر چھاؤں میں جا کر بیٹھا تھا
غم کا سورج پھر بھی سر پر دیکھا تھا

میں بھی جھوٹا، دنیا جھوٹی جھوٹا تو
میرے اندر کا انسان تو سچا تھا

اپنے دور کی خوشیاں سب کی یکساں تھیں
مستقبل کا دکھ تو سارا میرا تھا

چاند کے نیچے بیٹھ کے تو بھی چاند مرے
میری طرح سے چاند کو اکثر تکتا تھا

اب جو کنگالی کا رونا روتے ہیں
ہم نے بھی تو اپنے فن کو بیچا تھا

ہیرے موتی لاتا وہ بازار سے کیا
دامن میں سرشار کے ناقص سودا تھا

اکرام الحق سرشار

غزل

آپ کی یہ شرط ہے کہ دل میں تنہائی نہ ہو
معجزے سے کم نہیں جو اس میں رسوائی نہ ہو

لوگ بچھڑے ہیں مگر دل کی تمنا ہے یہی
رنجشوں کے درمیاں ایسی شکیبائی نہ ہو

زندگی کے ساتھ چلنا ہی پڑے گا عمر بھر
دل مگر یہ سوچتا ہے یہ بھی ہرجائی نہ ہو

یہ دعا ہے اپنے رب سے سانحہ ایسا نہ ہو
سامنے ہوں منزلیں تو دل میں پسپائی نہ ہو

ایک جیون کٹ گیا برکی کسی کی یاد میں
دل یہ کہتا ہے ہماری پھر شناسائی نہ ہو

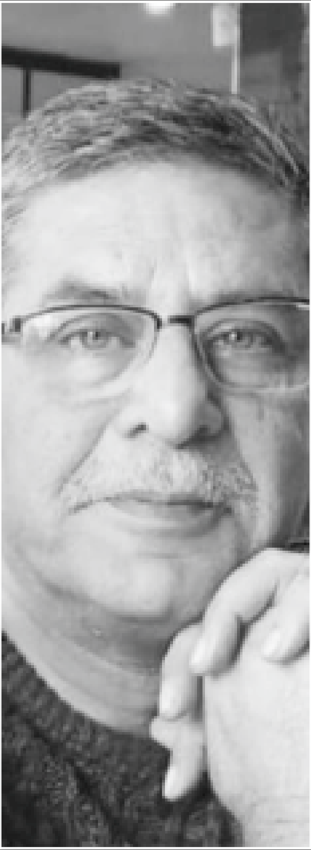

نثار برکی

انتخاب
خالد احمد
نعمان منظور

اس چھت سے کبھی دھوپ اُترتی نہیں خالد
عزت تو یہ دیتے ہیں گھرانے نہیں دیتے

غزل

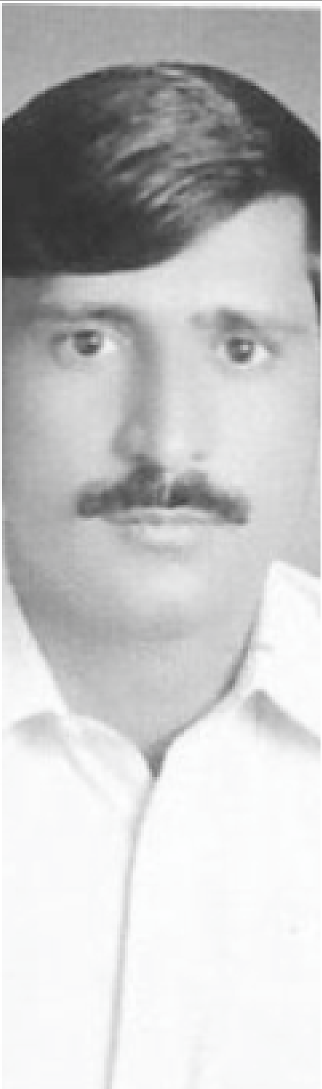

اعجاز دانش

سینوں سے اگر خوف نکالا نہیں جاتا
طوفان میں کشتی کو سنبھالا نہیں جاتا

جس دن سے تری یاد کا مہتاب ہے روشن
اس دن سے مرے دل سے اُجالا نہیں جاتا

کب تک تری یادوں کو کلیجے سے لگاؤں
اب مجھ سے ترا عشق سنبھالا نہیں جاتا

اس منصب و اعزاز کی توقیر ہے لازم
دستارِ فضیلت کو اچھالا نہیں جاتا

جس طور مری جان مجھے ٹال رہے ہو
ایسے تو سوالی کو بھی ٹالا نہیں جاتا

یہ نام ہر اک عہد کے ماتھے پہ سجا ہے
تاریخ سے مجنوں کا حوالہ نہیں جاتا

وہ درد جو اپنوں کی عنایت سے ملا ہو
دانش اسے الفاظ میں ڈھالا نہیں جاتا

غزل

سفر میں ہوں نہ ہوں ہر حال میں بے حال رہتے ہیں
ہمارے پاؤں سے لپٹے ہوئے بھونچال رہتے ہیں

پرانی یاد تو بچپن سے اپنے ساتھ چلتی ہے
نئے رستے یہ کیسے ہیں یہ کیوں پامال رہتے ہیں

زبوں حالی پہ اپنی صبر بھی کرتے رہے لیکن
چلو دیکھیں مصائب اور کتنے سال رہتے ہیں

یہاں سونے کی کانیں ہیں یہاں ہیروں کی کانیں ہیں
امیروں کی یہ بستی ہے یہاں کنگال رہتے ہیں

مہک، جگنو، ستارے، چاند سورج اور دیے غنچے
یہ کیا آفاق ہیں سب کچھ تری تمثال رہتے ہیں

کسی موسم کی شدت کا اثر اُن پر نہیں ہوتا
تمہاری یاد کی اوڑھے ہوئے جو شال رہتے ہیں

ابھی تو کچھ غمِ دوراں کا قصہ لکھ سکے ہیں ہم
ابھی کہنے کو دُنیا کے کئی احوال رہتے ہیں

ذرا سی ایک آہٹ پر یہ کیا ہلچل سی ہوتی ہے
بتا زیرِ زمیں لپٹے یہ کیوں بھونچال رہتے ہیں

کہانی چل سکے گی کیا بتا ہم کو تسلی سے
کئی کردار قصے میں اگر بے حال رہتے ہیں

کئی دُنیائیں بستی ہیں مرے اندر کی دُنیا میں
بکھیڑے بھی بہت ہیں یاں بہت جنجال رہتے ہیں

بظاہر اُن کو انساں کا بہت ہی پاس ہے، لیکن
حقیقت میں وہ وحشی ہی کی اوڑھے شال رہتے ہیں

اگرچہ آج قصہ ہیں سنہرے ایک ماضی کا
تصور میں مگر اپنے وہ ماہ و سال رہتے ہیں

قدم بوسی کی ہر پل میں تمنا دل میں رکھتا ہوں
نبیل احمد مدینے میں میرے لجپال رہتے ہیں

نبیل احمد نبیل

غزل

محمد یوسف

یہ تخت و تاج کا جنوں کتنا لہو بہا گیا
روتے ہوئے کوئی مجھے، دربار میں سُنا گیا

ہم بے نوا تو اِس لیے، جلتے رہے ہیں عمر بھر
ہر ایک شاہ جب گیا، اِک آگ سی لگا گیا

وہ بہانہ جُو چلا گیا، پھر عمر بھر مِلا نہیں
شاید پلٹ کے آئے وہ، میں یوں ہی دیکھتا رہا

الزام کا جواب دیں کیا اَب وفا کے باب میں
جاتے ہوئے بوں پہ وہ اِک مہر سی لگا گیا

اُسکو بچھڑتے وقت بھی کتنا مرا خیال تھا
جانے لگا تو شام کو گھر کے دیے جلا گیا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ کس کا دیدار ہُوا
آئینہ ، گُل نار ہُوا

غزل

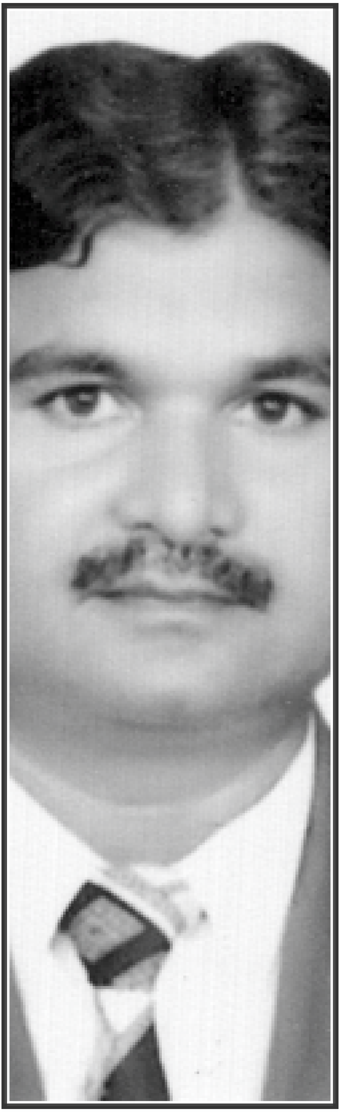

کسی مشروب نہ اچھی غذا سے
ہوا ہوں ٹھیک میں تیری دوا سے

اندھیری رات ہے گھر جا رہا ہوں
اجازت لے کے اپنے بے وفا سے

مجھے سچے دکھائی دے رہے تھے
مصیبت میں ترے جھوٹے دلاسے

سُنا ہے دشت کی پاگل ہوائیں
کریں گی دوستی بادِ صبا سے

زمانے سے تجھے منوا گئے ہیں
خداوندا ، محمد کے نواسے

اُنھیں کا غم کلیجہ کھا گیا ہے
رہے جو بر لبِ دریا پیاسے

بہت مانوس ہوتا جا رہا ہوں
تمہارے شہر کی آب و ہوا سے

مرے چوگرد ہیں اتنی بلائیں
”خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے“

انصر حسن

غزل

روتا کب تک ہے زمانے والو
ہجر کو روگ بنانے والو

جھانکو اپنے بھی گریبانوں میں
باتیں اوروں کی سنانے والو

دین مانے نہ کوئی مسلک کو
جھوٹے قصے ہی بنانے والو

شُکر کی دھوپ کو بھی پہچانو
غم کی بارش میں نہانے والو

دل کی گلیوں کا رہے دھیان ذرا
پھر نیا شہر بسانے والو

اب امیدیں تمھی سے ہیں ہم کو
رنگ میں بھنگ جمانے والو

بزم اُس کو نہیں اسٹیج کہو
آٹھ لوگوں کو بٹھانے والو

وہ تو نو میں ہے نہ ہے تیرہ میں
شعر روشن کو سنانے والو

اعجاز روشن

غزل

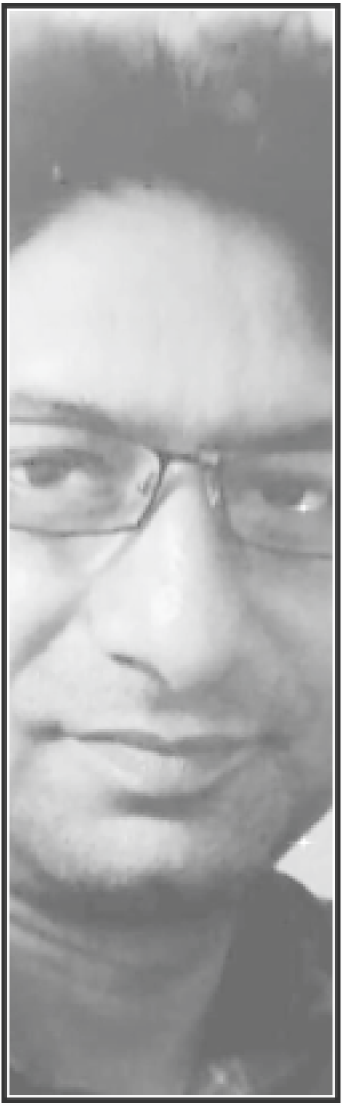

عمران ہاشمی

دم بہ دم زندگی میں پھنسے لوگ ہیں
ہیں جو انجان اِس سے، بھلے لوگ ہیں

اپنے ہونے سے دوچار ہیں کیا کریں
جتنے کھوٹے ہیں، جتنے کھرے لوگ ہیں

متفق ہیں جو اسباب موجود سے
وہ حقیقت سے کتنا پرے لوگ ہیں

توڑتے جو نہیں جبر کے قہر کو
وقت کی رہگزر میں رُکے لوگ ہیں

ہنس بھی دیتا ہوں، روتا ہوں، چُپ ہوتا ہوں
میری آنکھوں پہ ایسے کُھلے لوگ ہیں

اس لیے بھی نہیں نیند آتی مجھے
مجھ بدن میں کئی جاگتے لوگ ہیں

گا سکے ہی نہیں زندگی راگنی
دُھن تھی اچھی پہ ہم بے سُرے لوگ ہیں

رحم کر نیستی پہ نہ آ رحم کر
زندگی! تیرے قدموں تلے لوگ ہیں

غزل

زخم پھر سے اُبھرنے لگتا ہے
دل سمندر بپھرنے لگتا ہے

”جیسے ہی باغ میں اُترتی ہوں
باغ مجھ میں اُترنے لگتا ہے“

اُس کے آنے کی دھوم پڑتے ہی
آئنہ خود سنورنے لگتا ہے

کُھلتے جاتے ہیں دل دریچوں کے
وہ گلی سے گزرنے لگتا ہے

آنکھوں کی نیلگوں اداسی میں
ہجر بھی رنگ بھرنے لگتا ہے

دل مچلتا ہے خود اُسے دیکھے
مجھ پہ الزام دھرنے لگتا ہے

آنکھ کُھلتی ہے اِس خرابے میں
خواب آنکھوں میں مرنے لگتا ہے

کھول کر اک پرانی البم کو
دل کسے یاد کرنے لگتا ہے

بیٹھ جاتا ہے تھک کے شاہ سوار
گھاس، گھوڑا بھی چرنے لگتا ہے

شبہ طراز

غزل

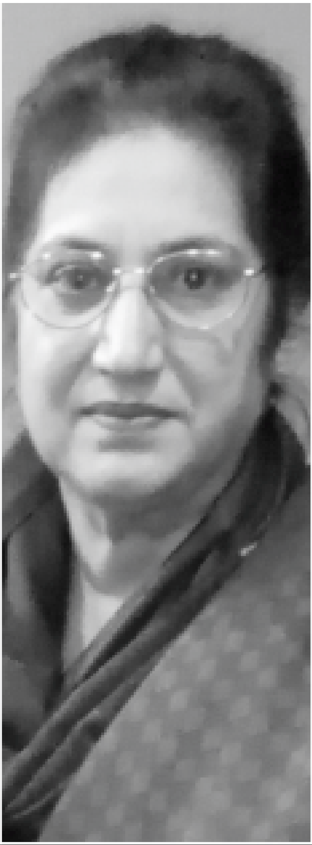

پروین سجل

کیا غنیمت ہے کیا نہیں کافی
ذوقِ تحسیں کو دل گزیں کافی

سوچنا کیا ہے دیکھنا ہے کیا
جو میسّر ہوا کہیں کافی

گردشِ چرخ چھین لینے دو
تنگیٔ جاں کو آستیں کافی

باغِ دنیا ہے دولتِ صحبت
کارِ ہستی کو ہم مکیں کافی

کیا برابر ہے قد کے ناپ ہوئی
تیرے میرے لیے زمیں کافی

آؤ شکنیں اُٹھائیں چادر سے
حاصلِ سیر خوش جبیں کافی

بیچ دریا سجلؔ اُترنا کیا
پار جانے کو ہے یقیں کافی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تُو کہے تو اِک دلِ صد داغ دِکھلاتا ہُوں مَیں
گِن سکے تو گِن ، ترے اِحسان گنواتا ہُوں مَیں

غزل

بے اشک ہیں عزا کی اداکاری کرتے ہیں
کچھ شمر بھی بلا کی اداکاری کرتے ہیں

جی بھر کے کوستے ہیں مجھے ساتھ بیٹھ کر
اٹھتے ہوئے دعا کی اداکاری کرتے ہیں

رسماً کسی کو پاس بلانا ہے ڈھونڈ دو
وہ لفظ جو صدا کی اداکاری کرتے ہیں

آنکھوں کے گرد لکھ کے کوئی کھیل بھر پر
پھر رات بھر وفا کی اداکاری کرتے ہیں

صہبا نہیں دلیل کوئی عشق و رقص کی
مے خوار، مبتلا کی اداکاری کرتے ہیں

تصویر کھینچ لیتے ہیں اک مشت بانٹ کر
اہلِ ریا، عطا کی اداکاری کرتے ہیں

پہلے ہی جا چکے تھے جو بیمار چھوڑ کے
کم بخت اب وبا کی اداکاری کرتے ہیں

شبنم میں ڈوب جائیں گے، آئے گی جب خزاں
تنکے جو ناخدا کی اداکاری کرتے ہیں

ساگر دیا بجھائیں گے اس حبس گاہ کا
زنداں کے در ہوا کی اداکاری کرتے ہیں

ساگر حضور پوری

غزل

مستحسن جامی

وحشت و خود سری کا سنگم ہوں
خود ہی مجرم ہوں خود ہی محرم ہوں

بعد میں دائمی سکوں ہو گا
میں زمانے کا آخری غم ہوں

پہلے میری چمک تھی دُنیا پر
اب اگرچہ میں تھوڑا مدھم ہوں

کوئی عادت ہے جان لیوا سی
اپنی ہستی سے خود ہی برہم ہوں

یہ حسیں اختلاف ہے جامی
گاہے خنداں ہوں گاہے پُرنم ہوں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

عمر بھر دکھ رگوں میں بھرتا ہے
جان لے کر ہی دل ٹھہرتا ہے

غزل

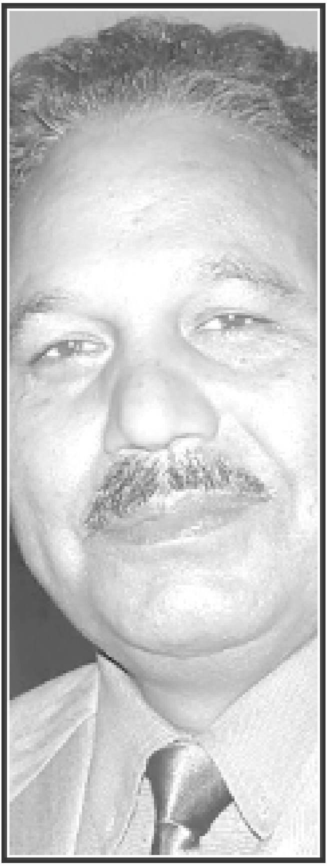

میتھیو محسن

بھوکا مرے کوئی شکایت نہیں
زہر تو کھانے کی اجازت نہیں

شہر لگے آج بھی جنگل کوئی
اس میں تو غربا کی حفاظت نہیں

دیر بڑی کر دی تو نے ڈاکٹر
رک گئی ہے سانس حرارت نہیں

طوق غلامی کا گلے آج بھی
سوچ سے جاتی تو جہالت نہیں

لیں امرا لطف تو ہر چیز کا
ٹھیک عوامی ہی معیشت نہیں

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

قلقلِ فکر نہیں ، ہمہمہء ذکر نہیں
گلِ کوزہ تھا ، صفِ کوزہ کشاں کا ہونا

غزل

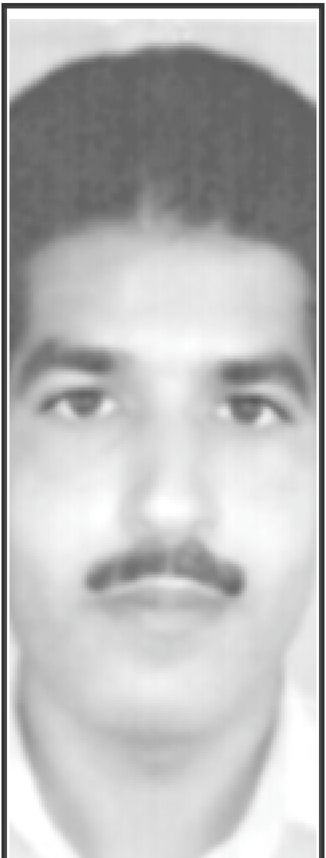

سرور فرحان

تذکرے کرتے ہوئے اک تذکرہ رہنے دیا
داستاں ساری سنا دی مدعا رہنے دیا

ہجر کی راتوں میں میرے خواب تک وہ لے گیا
چشمِ پُرنم میں مگر اک رتجگا رہنے دیا

لُطف دیتا ہے پرندوں کا اترنا بام پر
دانہ دُنکا اس لیے چھت پر پڑا رہنے دیا

بھول ہی جائے نہ کوئی گھر کا رستہ رات کو
گھر سے باہر اک دیا جلتا ہوا رہنے دیا

حُبِ مال و زر کے باعث جیت کے ہارے ہیں ہم
بھول کر حکمِ نبیؐ درّہ کُھلا رہنے دیا

قُرب اُس کا میرے حق میں ٹھیک ہی شاید نہ تھا
درمیاں حالات نے اک فاصلہ رہنے دیا

میری باتیں سن کے وہ بیزار سا ہونے لگا
میں نے ہونٹوں کو سیا اور بس سیا رہنے دیا

ہم نے جو دیکھا تھا خاموشی سے وہ سب لکھ دیا
دوسرے لوگوں کی خاطر تبصرہ رہنے دیا

غزلیں

عابد معروف مغل

کٹھن اس کے لیے سب راستے ہیں
یہاں گلیوں میں ہر سو منچلے ہیں

مرا مسکن وہی بستی ہے اب تک
مکیں جس کے ابھی تک سو رہے ہیں

رلائیں گے ہمیشہ یہ سبھی کو
یہاں جو منصفوں کے فیصلے ہیں

کوئی دانا سمجھ پاتا نہیں ہے
انوکھے عشق کے بھی ضابطے ہیں

تکے جاتے ہیں آنکھیں پھاڑے شب بھر
ستارے کیا زمیں پر ڈھونڈتے ہیں

کوئی کیوں پوچھتا مجھ سے نہیں اب
تمہارے آج کل کیا مشغلے ہیں

نجومی ہی سے جا کر پوچھ عابد
بتا قسمت میں کتنے رت جگے ہیں

داستاں میں شاہ زادے لڑ رہے ہیں
دیکھیے تو سب پیادے لڑ رہے ہیں

کون ہو گا پیر کا گدی نشیں اب
پیر کے سب پیر زادے لڑ رہے ہیں

وہ سیاست کر رہے ہیں اور اپنی
بے وقوفی، سیدھے سادے لڑ رہے ہیں

دشمنوں کی چال میں آئے ہوئے ہم
اوڑھ کر شک کے لبادے لڑ رہے ہیں

خون کی ہولی بپا ہے شہر میں کیوں
لوگ پاگل بے ارادے لڑ رہے ہیں

جو لڑاتے تھے کبھی لوگوں کو عابد
آج ان کے خانوادے لڑ رہے ہیں

غزل

میں رقص کرتا ہوا ، آئنے بناتا ہوا
گزر گیا تری گلیوں سے مسکراتا ہوا

یہ خالی گھر ہے یہاں کوئی بھی نہیں رہتا
بس ایک سایہ سا پھرتا ہے لڑکھڑاتا ہوا

پلٹ کے آیا تو چہرے پہ تھا تیرگی کی شکل
چراغ بن کے گیا تھا میں جگمگاتا ہوا

میں دل کی کہتا رہا اس کے روبرو پیہم
وہ بات سنتا رہا اور سر ہلاتا رہا

وہ ہنس رہا تھا کہ اس میں تو اُس کا ذکر نہیں
میں رو رہا تھا اُسے داستاں سناتا ہوا

تمام رات مرے ساتھ ساتھ چلتا رہا
زعیم وہ مجھے اپنی غزل سناتا ہوا

زعیم رشید

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

شاید مرا حریف بھی پہچان لے مجھے
مَیں آج __ اپنے شعر میں خود ڈھل کے آ گیا

غزل

جوں جوں وقت کا دریا بہتا جاتا ہے
میرے دل کا گھاؤ بھرتا جاتا ہے

آج بھی بادل بن برسے ہی گزر گئے
آج بھی دھوپ سے جسم جھلستا جاتا ہے

جوں جوں سورج افق کی جانب جھکتا ہے
سایہ میرے قد سے بڑھتا جاتا ہے

تاریکی ہے ہر سو چاند بھی روشن ہے
سپنوں کا اک تارا ٹوٹا جاتا ہے

تیرے خدوخال حسیں پیکر تیرا
میری سوچ کا محور بنتا جاتا ہے

باہر کے سب رستے بند ہوئے اشفاق
دل میں اک دروازہ کھلتا جاتا ہے

محمد اشفاق بیگ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لیے پھرتا تھا جو در در مجھ کو
بھول سکتا ہے وہ کیونکر مجھ کو

غزل

دل لگی میزبان کر لیں گے
اپنے جذبے جوان کر لیں گے

پھول رکھیں گے اپنے ہاتھوں پر
پھر مہکتا جہان کر لیں گے

جس سے کھلتی ہو آرزو کوئی
کام وہ میری جان کر لیں گے

رہ کی تاریکیوں کا خوف نہیں
چاند اپنا نشان کر لیں گے

تم جو آؤ گے زندگی میں میری
دل کا خالی مکان کر لیں گے

جس طرف عاشقی تری ہو گی
اس طرف دل کا مان کر لیں گے

دیکھ یٰسین دل یہ کہتا ہے
آرزو جہان کر لیں گے

محمد یٰسین بھٹی

غزل

میں کس سہولت سے اپنے ہی تن بدن میں آیا
مگر دمِ واپسیں لپٹ کر کفن میں آیا

یہ کون دستار باندھ کر آ گیا اچانک
یہ اب کے جاہ و جلال سے اب کے رَن میں آیا

میں آسماں کی فضا میں بوجھل ہوا تو فوراً
ذرا ٹہلنے زمیں کی باسی گھٹن میں آیا

یہ ٹہنی کس لمسِ خوش نما سے ہری ہوئی ہے
یہ کیسا بدلاؤ دفعتاً بانجھ پن میں آیا

نہ جانے کس نے بلایا ہے روبروئے منصف
نہ جانے تحریر ہو کے اب کیا سمن میں آیا

غزل مہینوں سے نا مکمل پڑی ہوئی ہے
کسی طرح بھی نہ خوش بدن وہ سخن میں آیا

جو کمسنی میں ہی خواب لے کر گیا تھا باہر
پلٹ کے لاشہ ہی اس کا آخر وطن میں آیا

شاہد شوق

غزل

محمد علی ایاز

بے وجہ زندگی سے کنارا کیا گیا
یعنی کہ ساری عمر خسارہ کیا گیا

شاید کسی تلاش کی تکمیل ہو سکے
پلکوں پہ ایک اشک ستارا کیا گیا

ہم سے جڑے بہت سے ہمارے نہیں رہے
جیسے ہی ایک شخص ہمارا کیا گیا

جونہی جواں رتوں نے بڑھائی بدن کی آگ
بچپن کا پہلا عشق دوبارہ کیا گیا

رکھی گئی مزاج میں الفت کی جستجو
لیکن مرے خمیر کو کھارا کیا گیا

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

ہر سخن تھا ہم اہلِ غم کے لیے
دل شکن ، دل خراش ، دل آزار

غزلیں

بچھڑ کے ملنا ہے پھر مُتّصل نہیں رہنا
تمام عُمر مجھے سنگ دِل نہیں رہنا

کریدنے سے ذرا پہلے سوچ لو مری جاں
کہ میرے زخم نے اب مُنضمِل نہیں رہنا

اسے بھی خاک میں ملنا ہے ایک روز سمجھ
یہ جسم رہنا ہے پر اس میں دِل نہیں رہنا

جُھلَستا رہتا ہے اس حسن کی تجلّی سے
نَحیف جسم نے پر مُشتَعِل نہیں رہنا

یقین کیسے کریں خوش گمانیوں کا ندیم
اگرچہ ہم نے یہاں مُستقِل نہیں رہنا

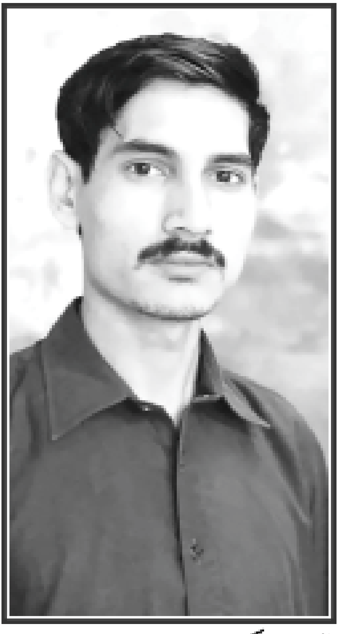

ندیم ملک

میں سوچ سوچ کے آنکھوں کو نم نہیں کروں گا
تری جدائی میں اب کوئی غم نہیں کروں گا

اٹھائے رکھوں گا سب ناز تیرے ہاتھوں پر
میں ایرے غیرے سے اس کو رقم نہیں کروں گا

بغور دیکھوں گا حالات اپنے پیچیدہ
ترے خیال کو آنکھوں میں ضم نہیں کروں گا

لکھوں گا وقت کے حالات پر میں طنزیہ شعر
سلگتی آگ میں تنہائی کم نہیں کروں گا

قصیدے لکھوں گا دن رات بر سرِ پیکار
تری جبیں کو کسی طور خم نہیں کروں گا

ندیم صبحِ منور حسین چہرے پہ
سیاہ فام اداسی کو دم نہیں کروں گا

غزل

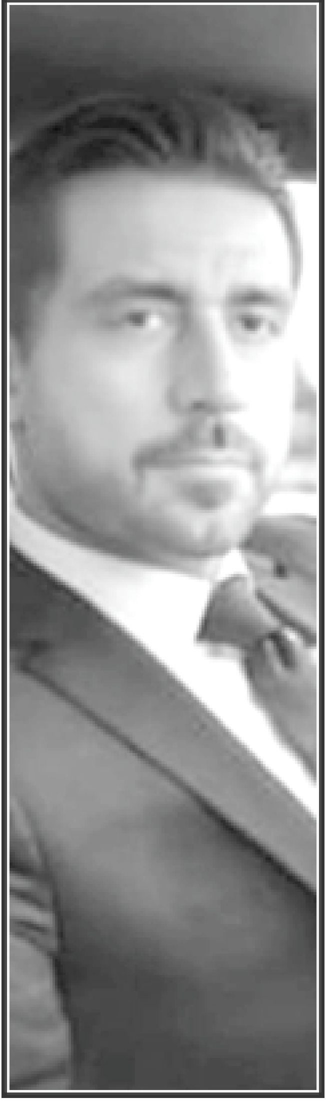

بشیر احمد حبیب

اس کے بھیجے ہوئے اسباب میں سب ممکن ہے
خاک مل جائے اگر آب میں، سب ممکن ہے

اس کہانی میں کئی موڑ ابھی آنے ہیں
تم سے مل جائیں کسی باب میں، سب ممکن ہے

اس کی قربت تو مرے ہوش لیے جاتی ہے
مجھ سے اِس ساعتِ کم یاب میں سب ممکن ہے

بغض ہو دل میں پہ باتوں سے محبت ٹپکے
یہ تو ہوتا ہے کہ احباب میں سب ممکن ہے

آگے چل کر بھی تو کردار بدل سکتے ہیں
اس کہانی کے کسی باب میں سب ممکن ہے

اس کے اندر ہی سے آتی ہے صدا اللہ ہو
ایسے کافر دلِ بے تاب میں سب ممکن ہے

آب پہنچے ہے یہاں اور لہو ٹپکے ہے
اب تو اس دیدۂ خوں تاب میں سب ممکن ہے

میرے کوچے میں، یہ ممکن ہے سوالی ہو حبیب
زندگی خواب ہے اور خواب میں سب ممکن ہے

غزلیں

محبت سے کنارہ ہو گیا تو؟
یہ دِل ٹوٹا ستارہ ہو گیا تو؟

بڑا مہنگا ہے یہ کارِ عقیدت
کوئی بھاری خسارہ ہو گیا تو؟

تو پھر کیا مان لو گے عشق کو تُم؟
بھنور میں گر کنارہ ہو گیا تو

تمھارے گیسوؤں کا کیا بنے گا؟
گھٹاؤں پر گزارا ہو گیا تو

ذرا سوچو کبھی مظلوم کوئی
اگر مُنصف تمھارا ہو گیا تو؟

تجلّی مانگتے ہو، پر یہ سوچو
کہیں سچ مچ نظارہ ہو گیا تو؟

محمد علی ادیب

بھری برسات کو سمجھا ہے کِس نے
حسیں جذبات کو سمجھا ہے کِس نے

ذرا سی بات پر کوئی مرا ہے
ذرا سی بات کو سمجھا ہے کس نے

خُدا کے نام پہ واعظ ہی واعظ
خُدا کی ذات کو سمجھا ہے کس نے

مِلن کے گیت بھاتے ہیں سبھی کو
جدائی کی رات کو سمجھا ہے کس نے

مرے حُلیے سے مجھ کو جانچتے ہیں
مرے حالات کو سمجھا ہے کس نے

ادیب اس کو صدا دو اب کہ اُس دن
ترے نغمات کو سمجھا ہے کس نے

غزل

راکھ ہو جائیں گے یہ آگ بجھاتے ہوئے لوگ
جان سے جائیں گے یہ جان بچاتے ہوئے لوگ

روز کے روز مجھے آ کے سلا دیتے ہیں
روز کے روز مجھے خواب دکھاتے ہوئے لوگ

کیسے چپ چاپ جہاں سے وہ گذر جاتے ہیں
ہر گھڑی بات سے باتوں کو بناتے ہوئے لوگ

عین ممکن ہے پہنچ جائے گھروں تک ان کے
سوچتے کب ہیں مگر آگ لگاتے ہوئے لوگ

وہ جہالت ہے کہ اندازہ لگانا مشکل
خود بھٹک جاتے ہیں اب راہ دکھاتے ہوئے لوگ

کیسے حساس ہیں ہر دکھ کو سمجھ لیتے ہیں
شعر سنتے ہوئے اور شعر سناتے ہوئے لوگ

اپنے رستوں کو بھی مسدود کیے جاتے ہیں
راہ اوروں کی یہ پُر خار بناتے ہوئے لوگ

خوف ہے ان کو اجالے کا چراغوں کا نہیں
تم جو دیکھو ہوا نھیں روز بجھاتے ہوئے لوگ

اب تو بس ایک ہی حسرت ہے بچایا دل میں
کاش دیکھوں میں کبھی لوٹ کے آتے ہوئے لوگ

کتنے کم ظرف ہیں بے درد پکاریں ان کو
ڈھل گئے درد میں جو درد بتاتے ہوئے لوگ

باندھ کر رختِ سفر رکھتے ہیں اپنا ہر دم
آسمانوں سے اتر کر ادھر آتے ہوئے لوگ

آ کے بتلاؤں تجھے نیند کا حاصل کیا ہے
خواب ہو جاتے ہیں تعبیر بتاتے ہوئے لوگ

مجھ کو ڈر تھا مری آنکھیں نہ چلی جائیں عطا
اس لیے دیکھے نہیں چھوڑ کے جاتے ہوئے لوگ

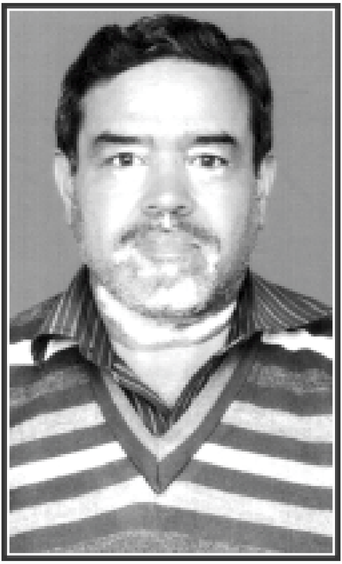

عطا العزیز

غزل

مجھے درکار ہے پانی جو صحرا کو چلا دے گا
میں چاہوں چھاؤں ٹھنڈی تو وہ جلتی دھوپ لا دے گا

میں صدیوں کی تھکن لے کر، کھڑا ہوں اس کی چوکھٹ پر
وہ لے گا صبح کا سورج، مجھے شام فنا دے گا

میں اپنی تیرہ بختی کا گلہ اس سے کروں تو کیا
اگر میں رنگ مانگوں تو وہ زخموں کی حنا دے گا

بہ ظاہر دیکھنے میں تو بہت معصوم لگتا ہے
مگر وہ چھین کر سب کچھ بس اِک جھوٹی دُعا دے گا

خوشی کی بھیک اس سے زین مانگوں بھی تو میں کیسے؟
خوشی کی وہ، لکیریں ہاتھ سے میرے مٹا دے گا

عبدالرؤف زین

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے بتِ زیبا! تری ضرب تغافل کی قسم
کرچی کرچی تیرے، قدموں میں بکھر جائیں گے ہم

غزل

لہولہان بدن انکشاف کرتے ہیں
انا پرست بھلا کب معاف کرتے ہیں

یہی ہیں جو کبھی پہلو سے لپٹے رہتے تھے؟
جو میرے پیار سے اب انحراف کرتے ہیں

ذرا لحاظ نہیں جن کو اپنی عزت کا
کہاں وہ دوسروں کا اعتراف کرتے ہیں

خدا کرے کہ ہمیشہ رہیں سلامت وہ
جو لوگ تجھ کو ہمارے خلاف کرتے ہیں

بس ایک پیڑ لگایا تھا عشق کا امجد
پرندے اب مرے گھر کا طواف کرتے ہیں

امجد خان تجوانہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جنگ دو گز زمین کی خالد
ہم نے اک عمر لڑ کے ہاری ہے

غزل

یوں حصے میں آتی نہ کبھی ہار ہمارے
ہمراہ کھڑے رہتے اگر یار ہمارے

دکھ درد میں ہنسنے کا ہنر سیکھ لیا ہے
دن، ہجر میں گزرے نہیں بیکار ہمارے

اس واسطے اک کونے میں بیکار پڑے ہیں
خوش رہتے نہیں ہم سے خریدار ہمارے

خستہ ہی سہی پھر بھی میاں! اچھے ہیں تم سے
ہنستے نہیں ہم پر در و دیوار ہمارے

ہم نے تو فقط فرض نبھانے کو کہا تھا
ناراض ہیں اس بات پہ سالار ہمارے

یہ سوچ کے ہم دار پہ ہنسنے لگے اکمل
تاریخ بتائیں گے یہ انکار ہمارے

اکمل حنیف

غزل

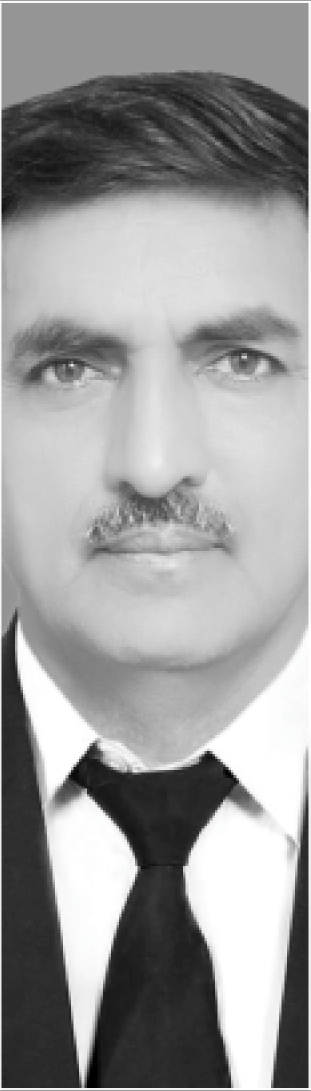

آنکھوں میں خوف پاؤں میں زنجیر دیکھیے
پانی پہ بہتے خواب کی تعبیر دیکھیے

دیوار میں پڑا ہے اگرچہ نیا شگاف
تخریب کے دنوں میں بھی تعمیر دیکھیے

چھوڑیں جناب ہجر کے قصّے کہانیاں
اُس کی ہمارے ساتھ یہ تصویر دیکھیے

لفظوں میں زندگی کے نگینے جڑے ہوئے
معنی کے پیچ و خم میں بھی تحریر دیکھیے

عُجلت کے نام پر کوئی صدمہ خرید کر
ماحول میں اذیتیں تاخیر دیکھیے

لیتا ہے کام ہوش سے منتوں میں غیب کے
عامل کے پاس جن کی بھی تسخیر دیکھیے

رُوحوں سے گفتگو کا تکلّم بھی حُسن ہے
امجد سُخن سے قُرب کی تاثیر دیکھیے

امجد بابر

غزل

اک تو آوارگی تری ہے گرد
دوسری مجھ میں آ گری ہے گرد

بیٹھ جاتا ہے جتنا بھی اُڑ لے
آخر آخر کو آدمی ہے گرد

سایہ مجھ کو میں سائے کو پکڑوں
دونوں ہم رقصوں کی اُڑی ہے گرد

میں ہوں خالی مکان کا کمرہ
جس میں ویرانی کی جمی ہے گرد

وقت کے بے کراں مجسمے کے
پایۂ سنگ سے جھڑی ہے گرد

یہ طلسمات کا جہاں ہے یاں
وحشتِ گرد سے ڈری ہے گرد

پار افلاک سے چھنا چھن چھن
تیری آواز کی سُنی ہے گرد

کوئی گزرا ہے جان سے عارض
بیٹھ جائے گی جو اُڑی ہے گرد

سرفراز عارض

غزل

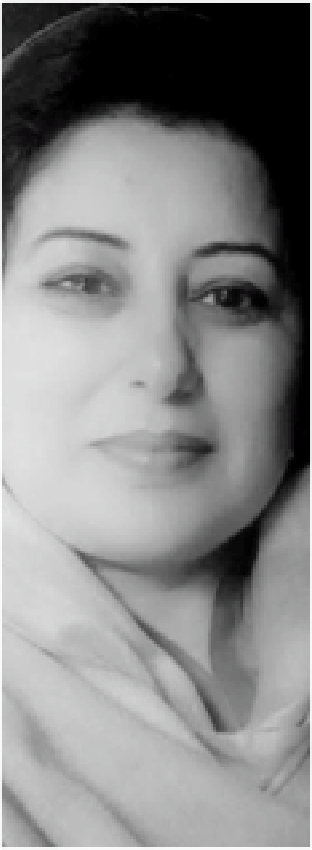

اب تیرے انتظار کی عادت نہیں رہی
پہلے کی طرح گویا محبت نہیں رہی

ذوقِ نظر ہمارا بڑھا ہے کچھ اس طرح
تیرے جمال پر بھی قناعت نہیں رہی

فرقت میں اس کی روز ہی ہوتی تھی اک غزل
اب شاعری ذریعۂ راحت نہیں رہی

دنیا نے تیرے غم سے بھی بیگانہ کر دیا
اب دل میں تیرے وصل کی چاہت نہیں رہی

کچھ ہم بھی تھک گئے ترے در پر کھڑے کھڑے
تم میں بھی پہلے جیسی سخاوت نہیں رہی

شازیہ اکبر

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

ہم وہاں سمت نما تھے خالد
جس جگہ نقش نشاں پانی تھا

غزل

شب ہے کوتاہ، داستان طویل
قصہ گو اب نہ کر بیان طویل

عمرِ کوتاہ، چار دن کا حساب
ہو گیا اور امتحان طویل

قد گھٹاتی ہے کیوں بھلا بدمست
ہو گئی کس قدر زبان طویل

اک اڑن طشتری میں رہتا ہوں
بھر نہ لوں آج اک اڑان طویل

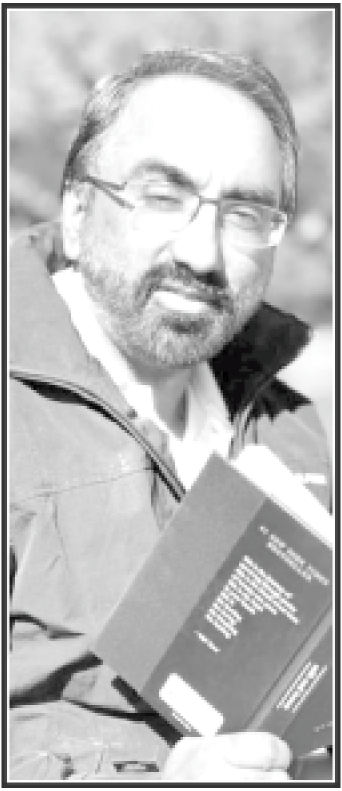

آسمانوں میں تیر چلتے ہیں
کھینچتا ہے کوئی کمان طویل

اسپِ تازی ہے روشنی کی کرن
اور اک دشتِ بے تکان طویل

رات، ملاح، جل پری، ناؤ
آسماں تنگ، بادبان طویل

تنگیٔ ذات، لمحۂ موجود
ہے مگر حدِ لامکان طویل

وسعتِ دل ضیافتِ شیراز
قصۂ باغِ اصفہان طویل

عابد رضا

غزل

صحرا کی ریت میری جوانی کو کھا گئی
جب پیاس بجھ گئی تو ندی پر میں آ گئی

اک لمس دل کے تار مرے چھیڑنے لگا
اک کائنات میرے بدن میں سما گئی

روشن رہے گی تا بہ ابد ان سے زندگی
آندھی بزعمِ خویش جو شمعیں بجھا گئی

سب کچھ بدل گیا ہے بدلتے سمے کے ساتھ
لیکن نہ اس حسین سے خوئے جفا گئی

آسان راہیں ہو گئی ہیں ممکنات کی
تصویر ایسے دونوں کنارے ملا گئی

سیدھی طرح سے جس کی سمجھ آ نہیں سکی
اک بات تھی جو مجھ کو مکمل تھما گئی

میں چاہتی تھی خود پہ ہوں اک پل میں منکشف
پھر رفتہ رفتہ اپنی سمجھ مجھ کو آ گئی

خواب و خیال ہو گیا لفظوں کا اعتبار
یہ زندگی سبق ہی کچھ ایسے پڑھا گئی

میں بھی جیا غموں سے نہیں سرنگوں ہوئی
امید کے سہارے پہ جیون بِتا گئی

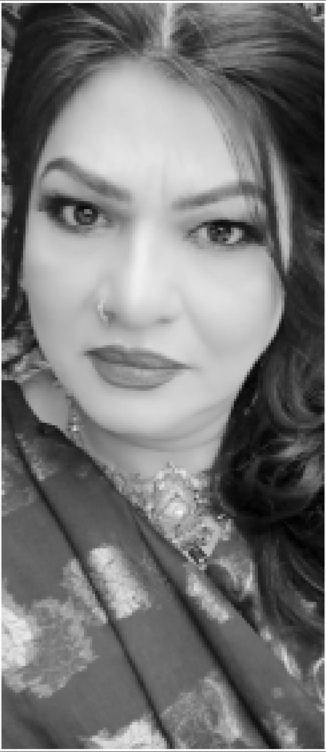

جیا قریشی

غزل

دل نے کتنا ترا خیال کیا
اس تعلق کو پھر بحال کیا

یہ بتاؤ کے لوٹ آؤ گے؟
میں نے عجلت بھرا سوال کیا

اپنی مرضی کے بادشاہوں کو
تیرے وعدے نے پائمال کیا

وقت مشکل بھی کٹ ہی جاتا ہے
آپ نے کون سا کمال کیا؟

اس اُداسی میں ذہنِ ساکت کو
تیری آواز نے نہال کیا

کاش ہم ایک ساتھ میں رہتے
بس اِسی بات کا ملال کیا

عام لوگوں پہ رعب کا ہے کا
ہم نے سردار سے سوال کیا

خود کو روکا بڑی دلیری سے
دل کی خواہش ترا خیال کیا

ہم سے خانہ بدوش لوگوں نے
مسکراتے ہوئے وصال کیا

تیرے تیز و طراز لفظوں نے
سادہ ذہنوں کو یرغمال کیا

تیرے جانے کے بعد طلحہ نے
دیکھیے مُنتخب زوال کیا

طلحہ غفور

غزل

دیا بجھا کے جلاتا ہوں اور دیکھتا ہوں
ہوا کو طیش دلاتا ہوں اور دیکھتا ہوں

غزل کے ساتھ مرا فوٹو کیسا لگتا ہے
میں فیس بک پہ لگاتا ہوں اور دیکھتا ہوں

یہ قد بتاتا ہے کتنا ہے ظرف اور کس میں
میں انگلیوں کو ملاتا ہوں اور دیکھتا ہوں

اب اور کون بنا ماں کے چپ کرائے گا
میں گھر میں شور مچاتا ہوں اور دیکھتا ہوں

بدل رہا ہوں بدل جاوں گا میں وقت کے ساتھ
یہ آئنے کو بتاتا ہوں اور دیکھتا ہوں

کسے سلام سے رغبت ہے اور کس کو نہیں
میں سب سے ہاتھ ملاتا ہوں اور دیکھتا ہوں

میں اس کو کیسے بتاؤں کہ اس کی آنکھیں نہیں
جو کہہ رہا ہے میں آتا ہوں اور دیکھتا ہوں

یہ وہم ہے کہ مجھے دیکھتا نہیں ہے کوئی
نظر کو اور گھماتا ہوں اور دیکھتا ہوں

وہ میری بات پہ کتنا یقین کرتا ہے
میں اس کو خواب سناتا ہوں اور دیکھتا ہوں

سمٹتی جھریاں حافظ بشکلِ قوسِ قزح
نحیف بوڑھے ہنساتا ہوں اور دیکھتا ہوں

حافظ الیاس حافظ

انتخاب

- خالد احمد -

ابھی تک آنکھ نَم ہے ، دل لہو ہے
مجھے کافی مرا پہلا وضو ہے

نعمان منظور

غزلیں

قربتیں بڑھنے لگی ہیں سو جدا جلدی کرو
مجھ کو تم اپنے تسلط سے رہا، جلدی کرو

ملنا ہے تو مل لو، کچھ کہنا ہے تو کہہ دو ابھی
میری خودداری سفر میں ہے، ذرا جلدی کرو

کمرے میں آیا کوئی تو، میری وحشت نے مجھے
چور دروازہ دکھایا اور کہا جلدی کرو

صبر کا پھل لگنے سے پہلے ہی جذبے مر گئے
اب کی باری ان درختوں کو ہرا جلدی کرو

ذائقہ زائل نہ ہو جائے کہیں سے درد کا
کوئی ہنگامہ نیا پھر سے بپا جلدی کرو

فرزان خان

جلد مجھ کو، میرے رشتوں کو نگلنے والی ہے
یہ اداسی جو مرے ٹکڑوں پہ پلنے والی ہے

کھیل دوبارا محبت کا نہیں ہو پائے گا
گیند اب کی بار کافی دور جانے والی ہے

جس طرح چاہے بنائے چاک دامن بخیہ گر
ہر سلائی نقش تیرے ہی بنانے والی ہے

ہاتھ میں پکڑے گلابوں کو چھپانے والا ہوں
وہ رقیبوں کے دیے تحفے دکھانے والی ہے

بیٹھ جاتا ہے وہاں خیمہ لگا کر میرا دل
بھانپ لیتا ہے جہاں پر دھوں اُڑنے والی ہے

دشت میں پانی میسر کس طرح آئے اسے
جل پری سینے سے میرے لگ کے مرنے والی ہے

غزل

دیکھ لو! اِک ادا آخری آخری
وہ حسیں من چلا آخری آخری

جاں بلب زندگی دے رہی ہے صدا
کیا یہ ہے کربلا آخری آخری

آج آباد پھر سے ہو شہرِ غزل
دے اگر وہ دوا آخری آخری

پوچھتے ہو چمن کی خبر آپ کیا
لُٹ گیا قافلہ آخری آخری

زندگی غم چشیدہ بسر میں نے کی
دیکھ! سیماب پا آخری آخری

زندگی اب گئی ہے ذرا لڑکھڑا
دے مجھے آسرا آخری آخری

دے رہا تھا ہمیں روشنی جو دیا
وہ دیا بُجھ گیا آخری آخری

اس نے پوچھا کہ ہے کون قاتل ترا؟
تم! کہا برملا آخری آخری

عباس علی شاہ ثاقب

غزل

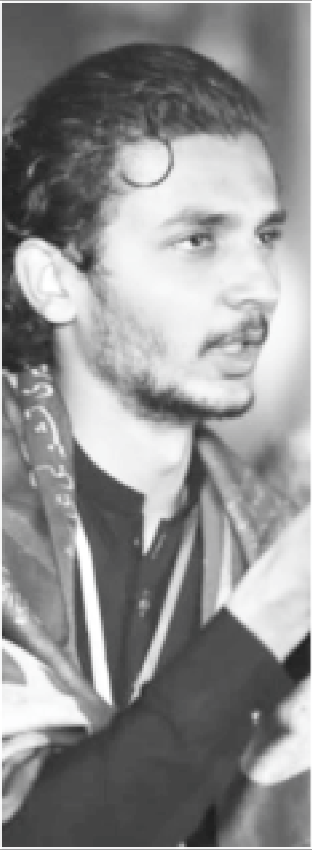

ہم دیکھیں گے تمھیں دریا کے کنارے کسی دن
بڑھ گئے حد سے اگر غم کے شرارے کسی دن

شب کی تاریکی مٹائے کبھی سورج بن کر
چاند بن کر وہ مری صبح سنوارے کسی دن

جن کو پڑھ کر مری حالت کا ہو اندازہ تمھیں
ایسے اشعار خدا مجھ پہ اُتارے کسی دن

ابھی مصروف ہے لیکن ملے فرصت جب بھی
اُسے کہنا کہ وہ سوچے مرے بارے کسی دن

جب محبت میں نمی تک نہ بچی ہوگی اسیر!
خشک لکڑی پہ چلائے گا وہ آرے کسی دن

اسیر حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پانی اُتر گیا، مگر آنکھیں بجھا گیا
سیلِ جمال اپنا نشاں تک مٹا گیا

غزل

زمیں پہ آخری اوتار ایک عورت ہے
ہر ایک مرد کی معمار ایک عورت ہے

زمین ٹوٹے ہوئے آئنے میں ڈھلتی ہوئی
کہ جس کے عکس میں بیمار ایک عورت ہے

طویل راگ پہ رقص و سرود میں ڈوبے
فنا کی چاپ سے بیزار ایک عورت ہے

وہ خوشبوؤں کے تعارف کی پہلی پہلی کتاب
جہانِ شعر میں شہکار ایک عورت ہے

شفق کی مد میں محبت کے رنگ بھرتی ہوئی
حسین شام کا اصرار ایک عورت ہے

وریداللہ ورید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دنیا فقط گماں ہے، سب کچھ درونِ جاں ہے
جاگو ضرور خالد، آنکھیں مگر نہ کھولو

غزل

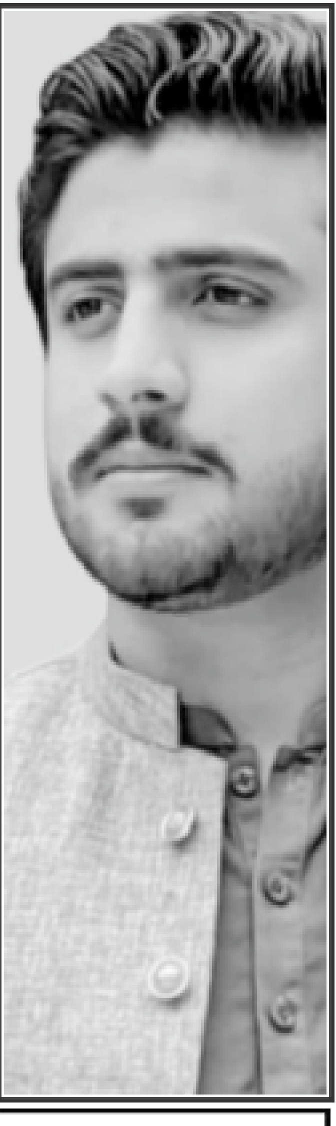

ہم نے دیکھا سدا معجزہ پیار کا
ہے انوکھا ہر اک زاویہ پیار کا

اُس سے یوں بھی مراسم بڑھاتا نہیں
ختم ہو جائے کب سلسلہ پیار کا

ہر قدم جو اُترتا گیا روح میں
کیسا دلکش تھا وہ راستہ پیار کا

زیست کی دلکشی سے وہ ہے بے خبر
جس نے چکھا نہیں ذائقہ پیار کا

رائیگانی سے خوف آرہا ہے مجھے
جب سے درپیش ہے سانحہ پیار کا

اُس کے آگے کروں حالِ دل کیا بیاں
جو سمجھتا نہیں ضابطہ پیار کا

نفرتوں کی فضا سے نکل کر اویس
یونہی چلتا رہے سلسلہ پیار کا

اویس اکبر

غزل

مٹی کی لڑائی ہے ، تو یہ ڈھیری تمھاری
تھوڑی نہیں آدھی نہیں لو ساری تمھاری

میں اپنے لیے اور جہاں کھوج رہا ہوں
یہ نظم کی دیوی یہ سخن ناری تمھاری

سچ ہے میں سنبھل پایا نہیں خاک نگر میں
تلوار تھی یا آنکھ تھی دو دھاری تمھاری

اک میرے لیے حکم ہوا ترک جہاں کا
اک میں ہی نہیں دنیا بھی تھی قاری تمھاری

جو کچھ یہاں موجود ہے موجود نہیں ہے
پھر بوجھ ہے کیا سانس ہے کیوں بھاری تمھاری

کچھ کار محبت کے ہیں سکے ابھی چلنے
پر دنیا کو چبھتی ہے یہ بے کاری تمھاری

حیرت ہے کہ تم بیٹھے ہو مسجد میں ابھی تک
سوچا تھا کبھی دیکھیں گے سنگساری تمھاری

تنہائی میں کچھ وقت اگر کاٹ رہا ہوں
اعجاز میں کرتا ہوں یوں دلداری تمھاری

اعجاز رضوی

IGNATIUS ''نیا کھاتہ''

جب اگناٹیئس اگربی کو نائیجیریا کا وزیرخزانہ بنایا گیا تو کسی نے خاص توجہ نہیں دی۔ مایوس لوگ کہتے تھے کہ وہ سترہ سالہ عرصہ کے دوران سترھواں وزیرخزانہ تھا۔'' پارلیمنٹ میں اپنے پالیسی بیان میں اس نے وعدہ کیا کہ وہ رشوت خوری اور بدعنوانی کا خاتمہ کر دے گا۔ اس نے شہریوں کو خبردار کیا کہ کوئی عہدہ دار خود کو محفوظ نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ بے داغ زندگی بسر نہ کرتا ہو۔ اس نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے کہا کہ ''میں نے ملک سے گندگی کے خاتمہ کا مصمم ارادہ کرلیا ہے۔'' وزیر کی تقریر کا یہ اثر ہوا کہ مشہور روزنامہ لاگوس ٹائمز نے اس کا ذکر تک نہ کیا۔ غالباً اخبار کے ایڈیٹر کا خیال تھا کہ چونکہ سابقہ سولہ وزیروں کی تقریریں تفصیل سے چھپ چکی ہیں اس لیے قارئین سمجھیں گے کہ وہی باتیں بار بار دہرائی جارہی ہیں جو وہ پہلے سن چکے ہیں۔

البتہ اگناٹیئس اس بات سے بددل ہونے والا نہ تھا کہ اس پر بھروسہ نہ کیا گیا ہے۔ وہ اپنے کام میں پوری قوت اور جوش سے مصروف ہو گیا۔ اپنے تقرر کے چند روز کے اندر اس نے وزارت خوراک کے ایک اہلکار کو جیل بھجوا دیا کیونکہ اس نے اناج کی درآمد کے کاغذات میں جعل سازی کی تھی۔ اس کی صفائی کی زد میں آنے والا اگلا شخص ایک لبنانی سرمایہ کار تھا، جس کو زرمبادلہ کے قوانین کی خلاف ورزی کے الزام میں ملک بدر کردیا گیا۔ ایک ماہ بعد ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جسے اگناٹیئس خود بھی ذاتی معرکہ سمجھتا تھا۔ یہ واقعہ تھا پولیس کے سربراہ کی رشوت کے الزام میں گرفتاری۔ اس ناجائز آمدنی کو لاگوس کے شہری اس عہدہ کے لیے معمول کی بات سمجھتے تھے۔ جب چار ماہ بعد پولیس کے سربراہ کو ڈیڑھ سال قید کی سزا دے کر جیل بھیج دیا گیا تو بالآخر لاگوس ٹائمز کو وزیرخزانہ کی خبر سامنے والے صفحہ پر دینا اور درمیانی صفحہ پر اخبار نے ''اگناٹیئس کی صفائی کی مہم'' کے عنوان سے اداریہ لکھا۔ اگناٹیئس کی شہرت دن بدن بڑھتی گئی۔

جیفرے آرچر
ترجمہ: پیروز بخت قاضی

معاشرے کی صفائی کی مہم جاری رہی اور ایک کے بعد دوسرا بدعنوان گرفتار ہوتا گیا۔ وزیر موصوف سے ہر مجرم خوفزدہ رہنے لگا۔ حتیٰ کہ شہر میں یہ بے بنیاد خبر گشت کرنے لگی کہ ملک کا سربراہ جنرل اوٹوبی بھی اپنے وزیر خزانہ کے زیر تفتیش ہے۔

اب دس کروڑ مالیت کے اوپر کے تمام غیر ملکی معاہدوں کی وہ خود پڑتال کرتا اور منظوری دیتا تھا اگرچہ اس کے مخالفین اس کے ہر فیصلہ کی اچھی طرح چھان پھٹک کرتے تھے۔ لیکن اس کے نام کوئی سکینڈل منسوب نہ ہو سکا۔

جب اکنا ٹیکس کا اس عہدہ پر دوسرا سال شروع ہوا تو ناامید اور مایوس شہریوں نے بھی اس کے کارناموں کا اعتراف کیا۔ اس وقت تک ملک کے سربراہ جنرل اوٹوبی کو اس پر کافی اعتماد ہو چکا تھا جب اس نے اکنا ٹیکس کو غیر رسمی طور پر مشاورت کے لیے طلب کیا۔

”اکنا ٹیکس! میں نے ابھی ابھی بجٹ کی تازہ رپورٹ پڑھی ہے۔ رپورٹ کا جو نتیجہ تم نے تحریر کیا ہے اس نے مجھے چونکا دیا ہے کہ قومی خزانے کو اب بھی سالانہ لاکھوں ڈالر کا نقصان ہو رہا ہے، جس کی وجہ غیر ملکی کمپنیوں کی طرف ایجنٹوں کو دی جانے والی رشوت کی بھاری رقوم ہیں۔ کیا تم کچھ بتا سکتے ہو کہ کن لوگوں کی جیبوں میں یہ دولت جا رہی ہے؟ میں یہی جاننا چاہتا تھا۔

اکنا ٹیکس اپنی نشست پر اکڑ کر بیٹھا تھا اور اس کی نگاہیں مسلسل سربراہ مملکت پر گڑی تھیں۔

”مجھے شک ہے کہ اس دولت کی زیادہ تر حصہ سوس بینک کے نجی حسابات میں جمع ہو رہا ہے لیکن فی الحال میرے لیے ثبوت فراہم کرنا ممکن نہ ہے۔“

”تو پھر میں تمھیں ہر وہ اضافی اختیار دینے کو تیار ہوں، جس کی تمھیں ضرورت ہوتا کہ تم حقائق معلوم کر سکو۔“

جنرل اوٹوبی نے کہا ”ان ملک دشمن افراد کی نشاندہی کے لیے جو طریقہ چاہو اختیار کرو۔ چاہے میری کابینہ کے موجودہ اور سابقہ ارکان سے تفتیش شروع کر دو۔ وہ چاہے کسی عہدہ پر فائز ہوں اور کتنے ہی بااثر ہوں تمھیں نہ ان سے ڈرنا چاہیے اور نہ ہی کسی کی طرفداری کرنی چاہیے۔“

”جنرل صاحب اس قسم کے مشن میں کامیابی کے لیے، مجھے آپ کے دستخطوں سے جاری کیا گیا خصوصی اختیار نامہ درکار ہوگا۔“

”یہ اختیار نامہ آج شام چھ بجے تک تمھاری میز پر ہوگا۔“ سربراہ مملکت نے کہا۔ ”اور خصوصی سفیر کا درجہ جب میں ملک سے باہر جاؤں۔“ ”منظور

”شکریہ“ اکنا ٹیکس نے کہا اور یہ سمجھ کر کرسی سے اُٹھا کہ انٹرویو ختم ہو گیا۔

”تمھیں اس کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے“ جنرل نے کہا اور وہ دونوں دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ سربراہ نے اکنا ٹیکس کو چھوٹے سائز کا ایک خودکار پستول دیا۔

”کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ اب تمھارے دشمن بھی تقریباً میرے برابر ہیں۔“

اکنا ٹیکس نے فوجی کے ہاتھ سے پستول لے لیا۔ اسے اپنی جیب میں ڈالا اور منہ بھینچ

کر شکریہ ادا کیا۔ دونوں کے درمیان مزید کسی لفظ کا تبادلہ ہوئے بغیر کار اگناٹیکس کو وزارت کی طرف لے گئی۔
سٹیٹ بینک نائیجیریا کے چیئرمین کے علم کے بغیر اور کسی سینئر سول سرونٹ کی مداخلت کے بغیر اگناٹیکس نے جوش وخروش سے اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ رات کو اکیلا ریسرچ کرتا اور دن کے وقت کسی سے اپنے نتائج بیان نہ کرتا۔ تین ماہ بعد وہ جھپٹنے کے لیے تیار تھا۔
وزیر خزانہ نے پیشگی پروگرام کے بغیر ملک سے باہر جانے کے لیے اگست کے مہینے کا انتخاب کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب اکثر نائیجیرین چھٹی پر جا چکے تھے اس لیے اس کی غیر حاضری کسی تبصرہ کے قابل نہ ہوگی۔ اس نے اپنے سیکرٹری سے کہا کہ اورلینڈو کی پرواز کے لیے اس کی بیوی، دو بچوں اور خود اسے اس کے لیے نشستیں مخصوص کرا دے اور کرایہ اس کے ذاتی حساب سے ادا کیا جائے۔
فلوریڈا پہنچ کر انھوں نے میریٹ ہوٹل میں قیام کیا۔ پھر اس نے بیوی کو وضاحت کے بغیر اتنا بتایا کہ وہ چند روز کام کے لیے نیویارک جائے گا جس کے بعد باقی تعطیلات گزارنے ان کے پاس واپس آجائے گا۔ اگلی صبح اگناٹیکس اپنے اہل خاندان کو ڈزنی کے حیرت کدہ میں چھوڑ کر نیویارک کی طرف پرواز کر گیا۔ لاگارڈیا ایئرپورٹ سے ٹیکسی کی وہ کینیڈی ایئرپورٹ گیا۔ وہاں کپڑے تبدیل کیے اور واپسی کا ٹورسٹ ٹکٹ خریدا اور سوس ایئر کے ذریعے جنیوا کے لیے خاموشی سے پرواز کر گیا۔
سوس دارالحکومت پہنچ کر اگناٹیکس نے ایک غیر معروف ہوٹل میں قیام کیا۔ وہاں پہنچ کر وہ بستر پر آٹھ گھنٹے تک گہری نیند سوتا رہا۔ اگلی صبح ناشتہ پر اس نے بینکوں کی فہرست کا جائزہ لیا جو اس نے نائیجیریا میں ریسرچ کے دوران تیار کی تھی، ہر نام اس نے اپنے قلم سے موٹے حروف میں تحریر کیا تھا۔ اگناٹیکس نے ایک بینک کا انتخاب کیا جس کی بلڈنگ ہوٹل کے بیڈروم سے نظر آتی تھی۔ اس نے فون ملانے سے قبل دربان سے نمبر کی تصدیق کی۔ چیئرمین نے بارہ بجے ملاقات کا وقت دیا۔
ایک پرانا بریف کیس اٹھائے اگناٹیکس وقت مقررہ سے چند منٹ قبل ہی پہنچ گیا جو ایک نائیجیرین کے لیے خلاف معمول تھا۔ اس نے خیال کیا کہ نوجوان شخص جس نے سلیٹی رنگ کا سمارٹ سوٹ، اسی رنگ کی ہلکی نیکٹائی اور سفید شرٹ پہن رکھی تھی، ماربل ہال میں اس کے لیے خطرہ تھا۔ اس نے جھک کر وزیر خزانہ سے اپنا تعارف چیئرمین کے پرسنل اسسٹنٹ کے طور پر کرایا۔ اس نے بتایا کہ وہ اگناٹیکس کے ہمراہ چیئرمین کے دفتر تک جائے گا۔ وہ وزیر موصوف کو لے کر لفٹ میں سوار ہوا۔
دونوں نے گیارھویں منزل پر پہنچنے سے پہلے ایک لفظ بھی ادا نہ کیا۔ بینک کے اہل کار نے چیئرمین کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی، جس پر انھیں اندر جانے کی اجازت مل گئی۔
”نائیجیریا کے وزیر خزانہ تشریف لائے ہیں جناب“ پی اے نے داخل ہوتے ہی کہا۔

چیئرمین اپنی کرسی سے اٹھا اور چند قدم آگے بڑھ کر مہمان کا استقبال کیا۔ اگناٹیئس نے دیکھا کہ چیئرمین بھی سلیٹی رنگ کا سوٹ، سلیٹی رنگ کی ریشمی ٹائی اور سفید قمیض پہن رکھی ہے۔

''صبح بخیر''۔ چیئرمین نے وزیر سے مخاطب ہو کر کہا ''آپ تشریف یہیں رکھیں گے؟'' چیئرمین نے کمرے دوسری طرف بچھی شیشے کی میز طرف جاتے ہوئے کہا جس کے گرد آرام دہ کرسیاں پڑی تھیں۔ ''میں نے اپنے اور آپ کے لیے کافی منگوائی ہے اگر آپ پینا پسند کریں۔''

اگناٹیئس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اپنا بوسیدہ بریف کیس اپنی کرسی کے قریب فرش پر رکھا اور شیشے کے بڑے فریم والی کھڑکی پر چند تعریفی جملے کہے اور اس دوران ایک نوجوان عورت نے ان تینوں کو کافی بنا کر پیش کی۔ جب وہ عورت کمرے سے باہر چلی گئی تو اگناٹیئس نے بات شروع کی۔

''میرے ملک کے سربراہ نے مجھے کہا ہے کہ میں آپ کے بینک میں جا کر ایک غیر معمولی درخواست کروں'' اس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

چیئرمین یا اس کے پی اے کے چہرے پر حیرانی کی رمق تک ظاہر نہ ہوئی۔

''مجھے صدر مملکت کی جانب سے یہ اعزاز بخشا گیا ہے کہ معلوم کروں کہ کونسے نائیجیرین شہریوں کے آپ کے بینک میں خفیہ حساب کھلے ہوئے۔''

یہ اطلاع ملنے پر چیئرمین نے لب کشائی کی ''مجھے یہ ظاہر کرنے کی آزادی حاصل نہیں۔''

''مجھے اجازت دیں کہ میں اپنی بات پوری کرلوں'' وزیر نے اپنی ہتھیلی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا ''پہلے تو میں یہ واضح کرنا چاہوں گا کہ میں حکومت کی طرف سے مکمل اختیار لے کر آپ کے پاس آیا۔'' دوسرا جملہ ادا کیے بغیر اگناٹیئس نے اپنی اندرونی جیب سے لفافہ نکال کر ہوا میں لہرایا اس نے لفافہ چیئرمین کو دیا جس نے خط نکال کر آہستہ سے پڑھا۔

خط پڑھ کر بینکر نے اپنا گلا صاف کیا۔ ''جناب مجھے افسوس ہے کہ اس خط کی میرے ملک میں کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔'' اس نے خط دوبارہ لفافہ میں ڈال کر اگناٹیئس کو واپس کر دیا اور سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا ''البتہ مجھے اس امر میں ذرہ برابر شک نہیں کہ آپ کو اپنے صدر کی جانب سے بطور وزیر اور سفیر مکمل اختیار حاصل ہے لیکن اس سے بینک کی رازداری کے اصول پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہم کسی بھی حالت میں اپنے کھاتہ داروں کے نام ان کی اجازت کے بغیر ظاہر نہیں کرتے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس سلسلہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا لیکن یہ بینک کے اصول ہیں اور یہ آئندہ بھی رہیں گے۔'' چیئرمین یہ سمجھ کر کھڑا ہو گیا کہ ملاقات اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی لیکن اس نے اگناٹیئس جیسے پاکباز مہم جو سے کوئی سودے بازی نہ کی تھی۔

''میرے ملک کے سربراہ نے مجھے آپ کو یہ بتانے کا اختیار دیا ہے کہ میرے ملک اور سوئٹزرلینڈ کے درمیان ہونے والے تمام لین دین آپ کے بینک کے ذریعہ ہوگا۔

اگناٹیکس نے اپنے لہجہ میں نمایاں طور پر نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا

''ہمیں آپ کے اعتماد پر فخر ہے۔'' چیئرمین نے کھڑے کھڑے بولا لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم اپنے کھاتہ داروں کی رازداری کا اصول بدلنے کے قائل نہیں ہیں۔''

اگناٹیکس نے یہ سن کر بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ ''اس صورت میں مسٹر گربر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم جنیوا میں اپنے سفیر کو ہدایت دیں گے کہ آپ کی وزارت خارجہ کو احتجاجی مراسلہ بھیجے کہ آپ ہمارے ہم وطنوں کے کوائف نہ دے کر عدم تعاون کے مرتکب ہورہے ہیں اس نے اپنے الفاظ کا اثر ڈالنے کے لیے قدرے توقف کیا اور پھر کہا'' البتہ آپ اس مشکل اور پریشان صورت حال سے بچ سکتے ہیں اگر آپ مجھے مطلوبہ کوائف بتادیں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم اپنی اطلاع کا ذریعہ کبھی ظاہر نہیں کریں گے۔''

''آپ خوشی سے اس قسم کا احتجاجی مراسلہ دیں۔ جناب یقین ہے کہ ہمارے وزیر خارجہ آپ کے سفیر کو سفارتی زبان کی تمام تر شائستگی کے ساتھ بتائیں گے کہ سوئس قانون کے تحت وزارت خارجہ اس قسم کے انکشاف کا مطالبہ کرنے کی مجاز نہیں ہے۔''

''اگر ایسی صورت ہے تو میں اپنی وزارت تجارت کو ہدایت جاری کروں گا کہ سوئس باشندوں کا نائیجیریا کے ساتھ ہر قسم کا لین دین اس وقت تک بند کردیا جائے جب تک ہمارے کھاتہ داروں نے نام ظاہر نہ کیے جائیں۔''

''جناب یہ آپ کا اختیار ہے'' چیئرمین نے اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے کہا

''اور ہم ان تمام معاہدوں پر نظرثانی کر سکتے ہیں جن پہ آپ کے ہم وطن نائیجیریا میں بات چیت کررہے ہیں۔ اس کے علاوہ میں ذاتی طور پر اس امر کا خیال کروں گا کہ پینالٹی کی شقوں کی پرواہ نہ کی جائے۔

''کیا آپ یہ فیصلہ کرنے میں قدرے عجلت نہیں برتیں گے؟''

''مسٹر گربر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس فیصلہ میں ایک منٹ کی تاخیر بھی نہ کی جائے گی۔ اگناٹیکس نے کہا' اگر وہ نام جاننے کے لیے آپ کے ملک کو گھٹنوں کے بل لانا پڑا تو میں رحم کے جذبے سے مغلوب نہ ہوں۔''

''ایسا ہی ہونے دیں وزیر صاحب'' چیئرمین نے جواب دیا ''لیکن میں اب بھی بینک کی رازداری کے اصول میں تبدیلی نہ کرسکوں گا۔''

''اگر صورت بدستور رہتی ہے تو جناب میں آج ہی اپنے سفیر کو ہدایت جاری کروں گا کہ جنیوا میں سفارت خانہ بند کردیا جائے اور لاگوس میں سوئس سفیر کو ناپسندیدہ شخصیت قرار دیا جائے۔''

پہلی بار چیئرمین کی پیشانی پر حیرت کی لکیریں نمودار ہوئیں۔

''مزید برآں میں لندن میں پریس کانفرنس بلاؤں گا'' اگناٹیکس گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمام دنیا کے پریس کو پتہ چل جائے گا کہ میرے ملک کے صدر نے اس بینک کے رویہ پر

ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی بدنامی کے رویہ پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی بدنامی کے بعد آپ کے بہت سارے کھاتے دار اپنے حسابات بند کر دیں گے۔ ''کئی کھاتے دار اپنے حسابات دوسرے بینکوں میں لے جائیں گے۔''

وزیر نے تھوڑی دیر انتظار کیا لیکن چیئرمین نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔

''آپ نے میرے لیے اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔'' اگناٹیکس نے اپنی کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ چیئرمین نے اپنا ہاتھ یہ سمجھ کر آگے بڑھایا کہ بالآخر وزیر نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لیکن جب اگناٹیکس نے اپنے کورٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چھوٹا سا پستول نکال لیا تو چیئرمین ٹھٹھک کر رہ گیا۔ جب نائیجیریا کے وزیر خزانہ نے آگے بڑھ کر پستول کی نالی چیئرمین کی کنپٹی پر رکھ دی تو سوس بینک کے دونوں افسروں کی رگوں میں خوف سے خون منجمد ہو گیا۔

''مسٹر گربر مجھے ان ناموں کی ضرورت ہے اور ابتک آپ کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ اس سے کم پر میں نہ مانوں گا۔ اگر تم فوری طور پر وہ نام فراہم نہیں کرو گے تو میں تمھارا بھیجا اُڑا دوں گا۔ سمجھے؟''

چیئرمین نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔

''اور تمھارا اسسٹنٹ میرا اگلا شکار ہو گا۔'' اگناٹیکس نے نوجوان اسسٹنٹ کی طرف رخ کر کے کہا جو چند قدم کے فاصلے پر جامد اور خاموش کھڑا تھا۔ اگناٹیکس نے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا ''ہمیں ہر اس نائیجیرین کا نام دو جس کا اس بینک میں حساب کھلا ہے ورنہ میں تمھارے چیئرمین کا بھیجا اڑا کر اس قالین پر بکھیر دوں گا۔'' اس کا لہجہ پھر سخت ہو گیا تھا۔ نوجوان اسسٹنٹ نے چیئرمین کی طرف دیکھا جواب کانپ رہا تھا لیکن اس نے واضح طور پر کہا ''پیٹر یہ ناممکن ہے۔''

''آپ دوست کہتے ہیں'' اسسٹنٹ نے سرگوشی کی۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے آپ کو ہر قسم کا موقع نہیں دیا۔ اگناٹیکس نے ہاتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ نوجوان اسسٹنٹ نے اپنی نگاہیں پھیر لیں کیونکہ وہ خوف کی حالت میں پستول کے فائر کا منتظر تھا۔

''بہت خوب'' اگناٹیکس نے چیئرمین کے سر سے پستول ہٹاتے ہوئے کہا اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ دونوں بینک افسران ابھی اک خوف سے کانپ رہے تھے اور بولنے کے قابل نہ تھے۔

وزیر نے اپنی بوسیدہ بریف کیس کرسی کے پاس سے اٹھایا اور اپنے سامنے چیئرمین کی میز پر رکھ دیا۔ اس نے دونوں طرف کے بکل دبائے اور بریف کیس کا ڈھکنا کھل کر روبرو ہو گیا۔ دونوں بینک افسروں نے نیچے دیکھا جہاں سو سو ڈالر کے نوٹ سلیقے سے قطاروں میں رکھے تھے۔ بریف کیس کا برانچ نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا تھا۔

چیئرمین نے فوری طور پر اپنے ذہن میں اندازہ لگایا کہ کل رقم پچاس لاکھ ڈالر کے لگ بھگ تھی۔

اگناٹیکس بولا ''جناب میرا آپ کے ہاں کھاتہ کھولنا کیسا رہے گا؟''

☆☆☆☆☆

ایک مقدس دن

نئے پجاریوں کے انتخاب سے پہلے عبادت گاہ میں ان کے امتحان کا بندوبست کیا گیا۔ وہ کل آٹھ پجاری تھے۔ جن کی لیاقت، شرافت اور خاندانی مرتبے کو معیار بنا کر منتخب کرلیا گیا تھا۔ ابتدا میں دو ماہ تک انھیں عقیدے کے مطابق رسم و رواج، مندر اور عبادات کو روایات اور اصولوں کے بارے میں ترتیب دی گئی، پھر ایک ہفتہ کے لیے انھیں دُعاوں کی کتابوں کو دے کر حکم دیا گیا کہ ان کے حافظے، ایمان اور اعتقاد کے آخری امتحان میں ان سے مخصوص دعائیں سنی جائیں گی۔ سورج کو چڑھاوے دینے کے بعد شاہی عبادت گاہ کے بڑے بڑے پیشوانے عبادت گاہ کے عین وسط میں اپنا تخت سجایا۔ اور اپنے ساتھ تین عمر رسید اور بارلیش ججوں کو بٹھانے کے بعد اس نے پجاریوں کو امتحان دینے کے لیے بلانا شروع کیا۔ ابتدائی دس اُمیدواروں سے روایتی اور قدیم دُعائیں سننے کے بعد پیشوانے دُعاؤں کے مقاصد، موقع، تعریف وتشریح کے لیے انھیں روکے رکھا۔ اپنی طرف سے بڑا اور مشکل امتحان لینے کے بعد اُس نے اُمیدواروں کامیاب ہونے پہ بادشاہ کی طرف سے سفید خلعت اور سنہرے رنگ کی پگڑی پہنائی۔ اس کے بعد اس نے باقی اُمیدواروں کو شام کے بعد امتحان کے لیے دوبارہ حاضر ہونے کا حکم دیتے ہوئے شاہی محل کی طرف کوچ کیا۔ جہاں اس نے بادشاہ کی دو کنیزوں کے ہاں بچے پیدا ہونے والوں بچوں کے لیے مذہبی رسمیں ادا کرنا تھی۔

شام کے وقت جب شاہی پیشوا دوبارہ عبادت گاہ میں آئے۔ تو اُسے اطلاع دی گئی۔ دس امتحان دینے والے اُمیدواروں میں سے صرف ایک آدمی آیا۔ باقی تو پجاری ہونے سے اس بات سے منحرف ہوگئے۔ کہ انھیں قبرستانوں اور جنازوں کے لیے منتخب کیا جائے گا۔ جنھیں وہ منحوس اور اپنی لیاقت کے خلاف سمجھتے تھے عبادت گاہ کے خادموں نے پیشوا کو یہ خبر دے کر مشتعل کر دیا تھا کہ بعض اُمیدواروں نے پیشوا کو ناقابل اعتبار، راشی اور لالچی آدمی سمجھ کر پجاری بننے سے انکار کر دیا ہے۔

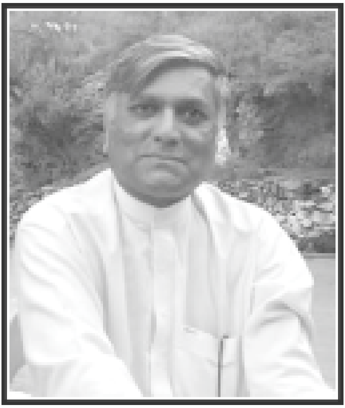

کلیم خارجی

جس پر مشتعل ہو کر پیشوا نے اپنے حمایتیوں کے ساتھ ملا کر عبادت گاہ کا دروازہ بند کروایا اور اشتعال انگیز خبر دینے والے دو آدمیوں کو عریاں کر کے عبادت گاہ کے اندر اتنا پیٹا کہ وہاں ان کی جان نکل گئی۔ امتحان دینے والے اُمیدوار یہ منظر دیکھ کر اپنے منہ کے اندر جمع ہونے والے کڑوے تھوک کو نگل نگل کر خود کو سہارا دینے لگا ستارہ گیا۔ کہ اُس نے امتحان کے لیے آ کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ کیونکہ اُسے عبادت گاہ میں دو عریاں لاشیں نظر آ چکی تھیں۔ اور وہ سمجھ چکا تھا کہ اُسے اپنی زندگی کا یہ پچھتاوا نگلنے لگا تھا۔ اور وہ اپنے گزشتہ تمام دُکھ اور مصائب کو بھول بیٹھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اب اس کے امتحان کا عملی مرحلہ شروع ہونے والا ہے اُسے عبادت گاہ کے عقبی حصے میں سوکھی لکڑیوں کے ڈھیر پہ لاشیں رکھ کے ان رسومات ادا کر کے اُنھیں آگ لگانا پڑے گی۔ وہ اپنے فرار کا موقع ڈھونڈ ہی رہا تھا۔ کہ اُسے لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا کام سونپ دیا گیا۔ بڑے پجاری نے خوشی اور اعتماد سے اُسے اپنے قریب بلاتے ہوئے کہا تم ہمارے ہو چکے ہو۔ تم سرکاری پجاری بن چکے ہو۔ اپنی قسمت دیکھو۔ تمھارے مقابلے پہ کوئی نہیں۔ تم پر دیوتاؤں کا خاص کرم ہے۔ ہم تمھیں بغیر کسی مشکل میں ڈالے بادشاہ کی دی ہوئی خلعت پہناتے ہیں۔ تم بادشاہ کے مندروں کے خاص پجاری بن چکے ہو۔ تم نے ان کی میتوں کو مقدس طریقے سے دیوتاؤں کے قدموں میں رکھنا ہے۔ اور اُنھیں اس طرح دُعاؤں سے الاؤ میں رکھنا ہے کہ ان کی روحوں کو تکلیف کا احساس تک نہ ہو۔

بڑے پیشوا نے اُسے خلعت پہناتے ہوئے سوال کیا، ذرا بتاؤ تو سہی۔ ان میتوں کو شعلوں کی نذر کرتے ہوئے تم کیا دُعا مانگو گے، وہ سفید خلعت اور سنہری پگڑی بہت دیر تک گھبراہٹ کی وجہ سے خاموش رہا۔ وہ سوچنے اور سمجھنے کی طاقت کھونے لگا تھا کہ پیشوا نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، گھبراؤ مت۔ پہلی دفعہ یہی معاملہ سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ سب گھبراتے ہیں بوکھلا جاتے ہیں۔ لیکن تمھیں تو ہمت دکھانی چاہیے۔ کیونکہ تم تو سرکاری پجاری بن چکے ہو۔ تم اب عام آدمی تو نہیں رہے۔ تمھارا کھانا پینا، رہن سہن، صحت، حفاظت اور زندگی کی سب ضمانتیں بادشاہ کی طرف سے مقرر کر دی گئیں ہیں۔ ہمت کرو اور وہ دُعا سناؤ۔ جو تم ان میتوں کی رسم میں ادا کرو گے۔ اس نے پیشوا کی آنکھوں میں دیکھا تو اس کی ہمت بیدار ہو گئی۔ اس نے دُعا کے لیے دونوں ہاتھ اپنے سامنے یوں پھیلائے جیسے اپنی طرف بڑھتے ہوئے کسی بڑی ہستی کا خیر مقدم کرنے لگا ہو۔ اس نے لب کھولنے سے پہلے گھورتے ہوئے پیشوا کو دیکھا۔ اور پھر لرزتے ہوئے بولا، اے دیوتاؤں کے بادشاہ، زمین کو زمین آسمان کو آسمان رہنے دے۔ ہوا کو ہوا، پانی کو پانی، سورج کو سورج اور چاند کو چاند رہنے دے۔ روٹی کو روٹی، نمک کو نمک، زندگی کو زندگی اور موت کو موت ہی رہنے دے۔ اے دیوتاؤں کے بادشاہ تو نے ابد سے جو چیز جہاں رکھی ہے اور جیسی رکھی ہے۔ اُسے ویسا ہی رہنے دے۔ بوڑھا پیشوا زور

سے دہاڑا۔ منہ بند کرو۔ یہ دُعائیں نہ تو ہماری مقدس کتابوں میں ہیں اور نہ ہم اپنے دیوتا سے ایسی دُعا مانگ کر اس کی توہین کر سکتے ہیں۔ تم تو دیوتاؤں کی گستاخی کر چکے ہو۔ تم نے کہاں سے یہ دُعائیں سیکھی ہیں۔

پیشوا کا غضب دیکھ کر وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا، حضور میں نے یہ ان مقدس کتابوں میں ایسی دُعائیں پڑھی ہیں۔ اس نے ایک طاقچے میں رکھی ہوئی کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے یہ دُعا ان کتابوں میں جگہ جگہ لکھی ہوئی پڑھی اور یاد کر لی ہے۔ بوڑھے پیشوا نے عبادت گاہ کے خاص منتظم پجاری کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ تم نے ممنوعہ کتابیں اب تک عبادت گاہ میں رکھی ہوئی ہیں - کیوں؟- کیا تم نے ان کتابوں میں اس قسم کی دُعا لکھی ہوئی دیکھی ہے،

پجاری نے پیشوا کے سامنے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ پیشوا جی یہ نوجوان ناتجربہ کار اور کم عمر ہے صحیح طور پر معانی اور تشریح کو سمجھ نہیں پایا۔ اسے جو دُعائیں سکھائی گئیں ہیں۔ وہ سب ان مقدس کتابوں میں موجود ہیں۔

پیشوا نے بڑے پجاری کے بال نوچتے ہوئے بری طرح جھنجھوڑ ڈالا - اور چیختے ہوئے کہا۔ تم اتنے بااختیار کیسے ہو گئے کہ دیوتاؤں کے لیے اپنے منہ کے الفاظ بولنے لگو۔ پجاری کو پاؤں سے ٹھوکر مار کے پیشوا ہانپنے لگا۔ اور پھر پھولی ہوئی سانسوں پہ قابو پاتے ہوئے عبادت گاہ کے منتظم پہ دھاڑا، ان ساری کتابوں کو اُٹھا کر جلا ڈالو۔ اور محل میں رکھی ہوئی مقدس کتابوں کو یہاں لا کر رکھو۔ منتظم پجاری نے چند خادموں سے کہہ کر طاقچوں سے کتابیں اُٹھوائیں - اور پیشوا سے التجا کرتے ہوئے بولا، کیوں نہ ان کتابوں کو ان لاشوں پہ رکھ کر جلا دیا جائے جنھیں لکڑیوں کے ڈھیر میں رکھ دیا گیا ہے۔

ٹھیک ہے اسی نوجوان پجاری سے یہ کام کرواؤ - تاکہ وہ ذہنی اور اخلاقی طور پر اپنے عقیدے میں مضبوط ہو سکے۔ اور دُعاؤں کے لیے تم اس پجاری کی رہنمائی کرو اپنا حکم سنا کر پیشوا دیوتا کے مجسمے کے پاؤں میں سر رکھ کر اپنے غصے اور لرزتے ہوئے بدن کی تھکن سے راحت پانے کے لیے اس لمبی آہیں بھرتے ہوئے سینے کے بل لیٹ گیا۔ وہ سینے کے بل لیٹے لیٹے ٹھنڈے فرش پہ سو ہی گیا تھا۔ کہ عبادت گاہ کے ایک خادم نے اس کے پاؤں چھوتے ہوئے اُسے بیدار کیا۔ اور بتایا کہ عبادت گاہ کے باہر لوگوں کا اک بہت بڑا ہجوم ہے۔ جو پیشوا کے سامنے آنے کے لیے للکار رہا ہے۔ پیشوا کے اندر بادشاہ وقت کا دیا ہوا اعتماد جاگ اُٹھا۔ اور وہ یوں ہجوم کے سامنے جا کھڑا ہوا جیسے کوئی اُستاد نالائق اور شریر بچوں کو سزا کے لیے اُسے اپنے پاس بلاتا ہے۔ وہ طاقت اور رُتبے کے اعتماد میں ہجوم کو گھورے جا رہا تھا کہ چند نوجوانوں اور ادھیڑ عمر لوگ دو عریاں لاشیں اس کے سامنے رکھتے ہوئے چیخنے لگے پھر ایک طاقتور شخص پوری طاقت سے آواز بلند کرتے ہوئے بولا یہ میتیں ہمارے مقدس دریا میں کیوں بہا دی گئیں جبکہ عبادت گاہ میں اُنھیں جلانے کی جگہ اور خاطر خواہ انتظام موجود ہے۔ کیا اب عبادت گاہ کے پہلو میں بہتے ہوئے

مقدس دریا میں لاشیں گرائی جائیں گی۔

عریاں لاشیں دیکھ کر پیشوا کے ماتھے پہ رنج اور خوف کی گہری شکن اُبھر آئیں۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے سرکاری عبادت گاہ کا منتظم اور نو منتخب پجاری لایا گیا۔ وہ اُنھیں سوالیہ نظروں سے دیکھ کر ہجوم کے چند جانے پہچانے چہروں کو اپنی حمایت کے لیے تیار کرتے ہوئے بولا، مجھے پورے معاملے سے آگاہ کیا جائے۔ ایک بہت کرخت اور ادھیڑ عمر غصے سے نعرے لگاتے ہوئے پیشوا کے بالکل قریب آ کر چیخا۔ یہ دونوں آدمی ہماری مقدس کتابوں کے صفحے پھاڑ پھاڑ کر دریا کے پانی پہ پھینکتے جا رہے تھے۔ کیا تم اپنی مقدس کی حفاظت اور حرمت کے قائل نہیں رہے پیشوا نے صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے ہجوم سے کہا۔ تم پر دیوتاؤں کا فضل ہو کہ تم نے دیوتاؤں کے کلام کو پانی میں بہہ کر مٹنے سے بچا لیا۔ یہ دونوں پجاری اس گناہ کے مرتکب ہیں۔ اُنھیں لاشوں کے ساتھ زندہ جلا دینے کے بارے میں تم سب کا کیا خیال ہے۔ ہجوم نے جوش میں آ کر پیشوا کی حمایت کی۔ تو پیشوا نے چند آدمیوں کے ہاتھوں میں تھامی ہوئی ادھڑی ہوئی کتابوں کو چوما اور پھر اپنے خاص خادموں کو اپنے قریب بلا کر رعب سے بولا۔ ان کتابوں کو پاکیزہ ہاتھوں سے جوڑ کر عبادت گاہ کے طاق میں رکھ دیا جائے۔ دیوتا اپنے کلام کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ ہمارے پاس دیوتاؤں کے دیے ہوئے رسائل موجود ہیں۔ ہم ان کتابوں کو نئے سرے سے دوبارہ بھی دیوتاؤں کی شان کے مطابق تیار کر لیں گے ہم اپنے مقدس دیوتاؤں کی تعلیم اور رہنمائی کے اُصولوں کو مٹنے نہیں دیں گے۔ وہ اپنے حمایتی افراد کو لے کر عبادت گاہ کے اندر لے آیا۔ اور دیوتا کے مجسمے کے سامنے سینہ پیٹتے ہوئے بولا، اے مقدس دیوتا۔ ہمیں اپنے غضب اور قہر سے محفوظ رکھ۔ ہم تیری خوشنودی کے لیے۔ دو لاشوں کے ساتھ دو زندہ آدمی بھی تیری نذر کرنے لگے ہیں۔ وہ دُعاؤں میں مصروف تھا لیکن وہ جان چکا تھا کہ مشتعل نوجوانوں کا اک ہجوم عبادت گاہ کے عقب میں لاشیں جلانے والی قربان گاہ کی طرف جا چکا تھا۔ اُسے دونوں پجاریوں کی درد میں ڈوبی ہوئی صدائیں بھی سنائی دینے لگی تھی۔ لیکن اس نے دُعائیں کرتے ہوئے اپنی آواز بلند کر لی۔ اور پوری عبادت گاہ دُعاؤں سے گونج اُٹھی۔ دیوتاؤں سے بھینٹ قبول کرنے کی دُعا بار بار عبادت گاہ کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھی اور عبادت گاہ کے عقب سے شعلوں کا پہاڑ نمودار ہو چکا تھا۔ دُعاؤں سے فارغ ہونے کے بعد پیشوا نعرے لگاتا ہوا اس ہجوم کی طرف آیا جو زندہ آدمیوں کو مردہ لاشوں کے ساتھ جلا کر ان پر مقدس تیل سے بھیگی ہوئی لکڑیاں پھینکے جا رہا تھا۔ وہ ان کے درمیاں یوں کھڑا ہو گیا جیسے ابھی ابھی کسی بلندی سے اُترا ہو اپنے احترام میں کھڑے لوگوں کو دیکھ کر اس کا بدن لرز اُٹھا اور وہ دوبارہ نعرے لگاتا ہوا اچھلنے لگا۔ آج کا مقدس دن دیوتاؤں کو امر کر گیا۔

☆☆☆☆☆☆

''خواب اور حقیقت''

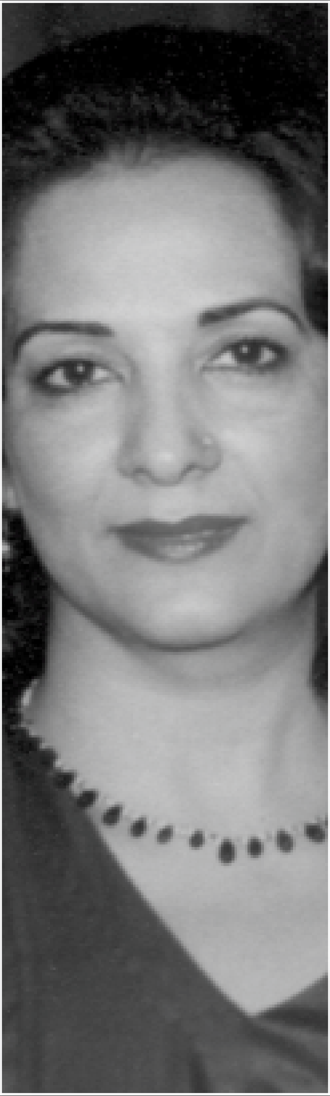

سیما پیروز

کچے آنگن میں دو چار پائیاں ساتھ ساتھ بچھی ہوئی تھیں۔ اوپر سفید براق چادریں چاندنی میں چمک رہی تھیں۔ دن بھر کی چلچلاتی دھوپ کے بعد اس وقت فضا میں رچی خنکی جسم و جان میں ٹھنڈک اتار رہی تھی۔ کچی مٹی پر چھڑکاؤ سے ایک عجیب سوندھی سوندھی سی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ کیاریوں میں کھلے موتیے اور چنبیلی کی خوشبو مدہوش کُن تھی۔

وہ اپنے بستر پر چت لیٹی رات کے اس پُرفسوں حسن سے مسحور سی تھی۔ اور ساتھ ہی بے چین بھی تھی۔ کوئی بے کلی اس کو گھیرے ہوئے تھی۔ کوئی خیال اس کے دل کو کچوکے لگا رہا تھا۔ اُس نے گردن موڑ کر ساتھ والی چارپائی پر نظر ڈالی خالد اس کی طرف کروٹ لیے سو رہا تھا۔ اس کے سانولے مردانہ ہاتھ چارپائی کی پٹی پر دھرے تھے۔ اس کے ہلکے ہلکے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ اسے خالد کی نیند پر رشک آیا۔ ''کیا مزے سے سو رہا ہے۔'' ''ایک میں ہوں پاگلوں کی طرح جاگ رہی ہوں۔ خدا جانے میں کیا چاہتی ہوں۔'' آم کے درخت کی اوٹ سے چاند جھانک رہا تھا اسے لگا جیسے وہ اس سے باتیں کر رہا ہو۔ اس کے ساتھ جاگ رہا ہو۔ ''تم کیوں بے چین ہو۔'' چاند اس سے مخاطب ہوا۔

"شاید اس لیے کہ میرے آنگن میں کھلنے والا پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گیا ہے۔"

"اوں ہوں۔" چاند کے لہجے میں یقین تھا جیسے وہ جھوٹ کہہ رہی ہو۔

"سچ! یقین کرو یہی وجہ ہے۔"

"ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ پھر مجھے یقین ہے کہ تم کسی اور وجہ سے بے کل ہو۔"

وہ کتنی دیر چاند کو خاموشی سے تکتی رہی۔

"سنو! کس چیز کی کمی ہے تمھاری زندگی میں! خوبصورت گھر ہے۔ جس میں آسائش کی ہر چیز موجود ہے۔ محبت کرنے والا شوہر ہے اور کیا چاہیے تمھیں؟"

"کیا انسان کی خوشیوں کا انحصار انہی باتوں پر موقوف ہے۔" وہ چاند سے مخاطب ہوئی۔

"تمھیں اور کیا چاہیے۔ جو تمھیں خوشی دے سکے۔" چاند کے لہجے میں سوال تھا۔

"پتہ نہیں! مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کیا چاہیے۔"

"اپنے دل میں جھانکو جواب مل جائے گا۔"

وہ خاموش رہی۔

"سنو! سایوں کے پیچھے بھاگنے سے بھی تو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ سوائے بے چینی اور بے کلی۔ کچھ باتیں خواب ہی رہیں تو بہتر ہوتی ہیں۔ جو حُسن نارسائی میں ہے وہ پانے میں کہاں؟"

تم کیا جانو ان باتوں کو۔" وہ مسکرائی۔

"کیوں میں کیوں نہ جانوں؟ ایک اور پتے کی بات بتاؤں۔ جو کشش اسرار میں ہے وہ ظاہر میں کہاں۔ اکثر اوقات چیزیں ظاہر ہو کر اپنا حُسن کھو دیتی ہیں۔ خواب کو خواب ہی رہنے دو۔ تعبیریں ڈھونڈو۔ اکثر اوقات تعبیر خواب کے بالکل اُلٹ ہوتی ہے۔"

"اچھا ہوگا مجھے کیا؟" وہ اکتا کر بولی۔

"لیکن تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا کہ تم اتنی بے کل کیوں ہو؟"

اُس نے چاند کی طرف سے کروٹ پھیر لی۔

اب ایسی دیوانی باتوں کا کیا جواب، مگر چاند درست کہہ رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے مطمئن نہیں تھی۔ ہر وقت ایک افسردگی اور بے چینی اسے گھیرے رہتی۔ جیسے اس کا کچھ کھو گیا ہے۔ کوئی کمی ہے اس کی زندگی میں۔ وہ بے مقصد ہی جیئے جا رہی ہے۔ دیکھا جائے تو اس کی زندگی میں کوئی کمی نہیں تھی۔ چھوٹا سا گھر تھا محبت کرنے والا شوہر تھا، جو بساط بھر اس کے لیے خوشیاں سمیٹنے میں لگا رہتا۔ رشنا کے منہ سے نکلی ہر بات اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ سسرال گاؤں میں تھا۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ اپنے گھر کی وہ مالک ومختار تھی۔ چاہے سیاہ کرتی چاہے سفید کوئی باز پرس کرنے والا نہیں تھا۔ خالد اسے پا کر بے حد خوش تھا۔ ویسے تو وہ بہت اچھی تھی، سُگھڑ سلیقہ شعار، نیک خصلت اور خوب صورت پر وہ اس کی خاموشی اُداسی پر اکثر پریشان ہو اُٹھتا۔ انجانے وسوسے اس کو گھیر لیتے۔ "شاید رشنا مجھے پسند نہیں کرتی؟ ہو سکتا ہے کسی اور کو چاہتی ہو۔" پھر خود ہی

اپنے خیال کی تردید کر دیتا۔
جن دنوں وہ پہلی بار ماں بننے والی تھی۔ کافی خوش رہی تھی۔ خالد کسی نازک آبگینے کی طرح اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ ایک مائی کام کے لیے رکھ لی تھی۔ اس کے کھانے پینے اور آرام کا اس قدر خیال رکھتا کہ رُشنا کو بے اختیار خالد پر پیار آ جاتا۔ خالد کو رشنا کی خوشی سے جیسے سارے جہان کی خوشیاں مل گئی تھیں۔ پھر نہ جانے ان کی خوشیوں کو شاید اپنی ہی نظر لگ گئی۔ اور رشنا بیمار ہو گئی۔ خالد نے کس کس طرح اُسے تسلی دی اس کا دل بہلایا۔ حالانکہ بچہ ضائع ہونے کا خالد کو بھی غم تھا۔ پر اُس نے رشنا کے سامنے ذرا سے بھی دُکھ کا اظہار نہیں کیا۔
رشنا کے آنسو خالد نے اپنے ہاتھوں سے پونچھے اور اُسے دلاسہ دیا۔ ”کیوں رو رو کر اپنی جان ہلکان کر رہی ہو۔ بس اللہ کو منظور نہیں تھا اس میں کوئی بہتری ہو گی۔ اور ہم کونسا بوڑھے ہو گئے ہیں۔“ رشنا مسکرا پڑی۔
”شکر ہے تمہارے چہرے پر مسکراہٹ تو آئی“ لیکن وہ مسکراہٹ دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ رشنا پھر سے خاموش اور اداس سی ہو گئی تھی جیسے پھر سے اپنے خول میں بند ہو گئی تھی۔
رُشنا نے بے کلی سے کروٹ بدلی۔ آج وہ پہلے سے زیادہ بے چین تھی۔ یکا یک اُسے محسوس ہوا کہ یہ ماحول اور فضا بڑی مانوس سی ہے اِسے یاد آ گیا ویسا ہی پرفسوں ماحول تھا اور وہی مہک تھی۔ ایسی ہی ایک چاندرات اپنے ننھیال کے گاؤں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے کسی نے اسے اپنی بانہوں میں جکڑ کر دو جلتے ہوئے انگارے اس کے ماتھے پر رکھ دیئے تھے۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ وہ چیخ بھی نہیں سکی تھی وہ اس ہیولے کو دیکھ بھی نہیں پائی تھی۔ بس آنے والا آم کے گھنے پیڑ کے پیچھے سے نکلا اور اس کے ماتھے پر مہر ثبت کر کے چشم زدن میں غائب ہو گیا اسے سب سے پہلا خیال تو کسی جن بھوت کا آیا تھا۔ کئی روز وہ پریشان اور شرمندہ سی رہی کسی سے ذکر تک نہ کر سکی کیا بتائے؟ بات ہی عجیب سی تھی ناقابل یقین اور شرم ناک جب بھی اسے سب کچھ یاد آتا اس کی کان کی لوئیں سرخ ہو جاتیں اور ماتھے پر انگارہ سا دہک اُٹھتا وہ غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھ لیتی پھر وہ گاؤں سے واپس آ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ سب کچھ بھول بھال جائے گی۔ جانے کس نے شرارت کی تھی۔ مگر ہوا یوں کہ سوتے جاگتے وہ خود کو دو بانہوں کے حصار میں قید محسوس کرتی۔
اس نے ایک بُت تراش لیا تھا جو ہر دم اس کے ساتھ رہتا۔ ہر گھڑی وہ اس کی منتظر رہنے لگی، ہر چہرے میں وہ اپنے تصوراتی محبوب کو تلاش کرتی رہتی مگر کوئی چہرہ بھی اس کے خیالی پیکر جیسا نہیں تھا۔ وہ کھوئی کھوئی اور اداس رہنے لگی۔ گھر والے اس کی صحت

کے بارے میں کافی فکرمند تھے۔ کئی ڈاکٹروں اور حکیموں کو دکھایا گیا، مگر وہ ویسی ہی رہی۔ لاکھ پوچھنے پر بھی وہ اپنی افسردگی کا کوئی سبب نہ بتا پاتی تھی۔ اسی اثنا میں اس کی شادی ٹھہرا دی گئی سب کا خیال تھا کہ شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گی اس کا ہونے والا شوہر اس کا دور پار کا رشتہ دار تھا لاکھ یاد کرنے پر بھی اس کی صورت اس کے ذہن میں نہ آتی جب بھی وہ اپنے منگیتر کا خاکہ ذہن میں بنانے کی کوشش کرتی۔ اس کے سامنے خیالی محبوب کا چہرہ آ جاتا۔ سہاگ کی سیج پر بیٹھی بھی وہ اسی خیالی پیکر کی منتظر تھی۔ خالد نے جس اس کا گھونگھٹ اٹھایا تو اُس نے پوری آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا اور پھر مایوس ہو کر سر جھکا لیا۔ شادی کے بعد وہ اور بھی بجھی بجھی رہنے لگی۔

جانے رات کا کونسا پہر تھا۔ شاید آدھی رات تھی۔ وہ آ گیا تھا۔ آہ کتنا انتظار کیا تھا اُس نے۔ اس کے خوابوں کا شہزادہ آخر آ ہی پہنچا تھا۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کہاں چلا گیا تھا۔ ''میں نے کتنا انتظار کیا تمہارا'' لیکن جیسے اس کی قوت گویائی صلب ہو گئی تھی۔

وہ کسی کی مضبوط بانہوں کے حصار میں تھی۔ اس نے آنکھیں کے کھولے بنا ہی بانہوں کے در وا کر دیے۔ اس کی کان کی لو کے پاس ہونٹوں کا لمس جاگا۔

''رُشنا تمہیں تین سال پہلے کی ایک رات یاد ہے۔''

''میں اور کچھ یاد نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ خواب میں ہی بولی۔

''گاؤں میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے کسی نے تمہارے ماتھے پر لبوں کی مہر ثبت کی تھی۔''

''جانتی ہو وہ کون تھا؟'' خالد نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

پھر جواب کا انتظار کیے بغیر خوشی سے سرشار بولا ''وہ میں تھا۔''

رُشنا کا جیسے خواب ٹوٹ گیا خالد کی آواز سن کر پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

''وہ تم..... تم تھے خالد۔'' وہ کراہی۔

وہ سرگوشیوں میں اسے اپنی داستان محبت سنا رہا تھا کیسے وہ اس کی پہلی جھلک دیکھ کر ہی پاگل ہو گیا تھا۔ وہ اسے بانہوں میں جکڑنے کی دیوانگی وہ اس کے ماتھے پر بوسہ دیتا۔ اتنے سال میں نے تمہیں اس ڈر سے نہیں بتایا کہ تم کہیں مجھے آوارہ بدمعاش نہ سمجھ لو۔ یقین کرو میں انتہائی شریف انسان ہوں۔ اور جانتی ہو تمہارا رشتہ حاصل کرنے کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔''

وہ خوش دلی سے ہنسا۔''

''بس تمہارے حسن نے دیوانہ کر دیا تھا۔ وہ اس کے کانوں میں محبت کا فسوں پھونک رہا تھا۔ پھر وہ اس کی بانہوں میں بھربھری مٹی کی طرح بے جان ہو گئی تھی۔

☆☆☆☆☆

وہ تمھارا آشیانہ بھی نہ رہا

طلعت! تمھارا مکان فروخت ہو گیا

دیکھو تو ایک سیدھی سی کہانی ہے سوچو تو سراغ حیات ہے-- یاد ہے ابا جی پڑھاتے تھے ہمیں (یہ صدیوں پہلے کی بات ہے)---

''ہر کہ آمد عمارت نو ساخت، رفت'' پھر ترجمہ کر کے بتایا جو کوئی آتا ہے نئی عمارت بناتا ہے چلا جاتا ہے-- بظاہر لگا بھی ہر کوئی تو عمارت نہیں بناتا مگر عمارت بنانے کے ظاہری معنی بھی بجا ہیں باطنی بھی۔

اس گھر کے پلاٹ کی خریداری سے پہلے بہت جستجو کی گئی بھائی خالد نے یہ بھی چاہا ان کے والدین کے گھر کے قریب کہیں ہو مگر گنجان علاقہ تھا پھر ہماری تیسری بہن نے چاہا اس کے نزدیک ہو مگر وہ خود بعد میں ملتان شفٹ ہو گئی۔ مقدر گارڈن روڈ کے اس پلاٹ تک لے آیا جو میرے گھر کے پہلو میں تھا کسے خبر تھی کہ آخری سفر بھی یہیں سے ہو گا ان دونوں کا۔

جب مکان تعمیر ہو رہا تھا ہم سب بہت خوش اور پُر جوش تھے نیچے کا پورشن مکمل ہوا، اوپر کا تعمیر ہونے لگا خدا خدا کر کے سب کچھ مکمل ہو گیا اور بھائی خالد اور طلعت کی فیملی شفٹ ہو گئی میں نے مٹھائی بھیجی مبارک سلامت ہوتی رہی اپنا گھر بنا کے انسان کتنا خوش ہوتا ہے اس کے گوشے گوشے پہ تبصرہ اور داد چاہتا ہے۔

میں تو سمجھتی ہوں انسان چاہے عمر رسیدہ ہو یا کم عمر اندر سے معصوم محدود اور سادہ ہے۔

ایک ہرا بھرا دور تھا۔ خوشیوں بھرا میلہ تھا۔ ہم دونوں کا صبح شام کا ساتھ، دکھ سکھ کا ساتھ، سحری افطاری کا ساتھ، عید بقر عید کا ساتھ، سرما گرما کا ساتھ، سیلاب کے خدشات کا ساتھ، اچانک آ جانے والے مہمان کی خاطر داری کا ساتھ، مشترکہ پڑوس آنے جانے کا ساتھ، پھر وہ ساتھ ٹوٹ گیا ہاتھ سے ہاتھ چھوٹ گیا-- نہ طلعت رہی نہ خالد رہا نہ جنوں رہا نہ پری رہی۔

ہمارے یہ روپیہ روپیہ جوڑ کر بنائے گئے مکان جن کو چمکاتے سجاتے نہیں تھکتے یہ بھی ہماری یاد کو آٹے میں سے بال کی طرح نکال پھینکتے ہیں یا یہ بھی بیچارے ہماری طرح صابر شاکر ہوتے ہیں۔

دردانہ نوشین خان

طلعت --- تمہارے مکان کے وہ ڈھلتے بدلتے سائے -- گیٹ کے ساتھ چڑھتی بیل-- داخلی دروازے کا دو سٹیپ زینہ وہ پتھر کے بڑے گملے ---گراج جہاں دو گاڑیاں ہوتی تھیں جہاں موٹر بائیک اور چھوٹی سائیکل ٹیوب لائٹ کی روشنی میں چمکتی تھیں زندگی کی چہل پہل ہوتی تھی رات گئے تک کھلا رکھنے والا بیرونی گیٹ --- منظم اُجلا باترتیب ڈرائنگ روم جہاں تمہاری سہیلیوں کے گروپ خوش گپیاں کرتے تھے قہقہے لگاتے تھے-- تمہارے کمرے تمہاری فیملی فوٹوز سے مزین دیواریں-- تمہاری شیلڈز سے بھرے کیبنٹ -- اب وہاں اجنبی لوگوں اجنبی چیزوں اجنبی چہروں کے معمولات ہوں گے-- آہ

کونسا گیت سنو گی تم؟
یادوں کی سنگیت میں
ہجر فراق کے گیت ہیں
پریت بھرے میت ہیں
کونسا گیت سناؤں میں؟

بہت نامانوس منظر تھا جو آج دیکھ کر آئی ہوں الفاظ اس کی تصویر کشی نہیں کر سکتے اجڑی دیوار پہ بھائی خالد کی قد آدم تصویر حیرت سے تکتی تھی جیسے پہچاننے کی کوشش کرتی ہو- سب ادھ کھلے دروازے روٹھے ہوئے لگتے تھے فرش پر بے معنی تحریریں تھیں باورچی خانہ منہ پہ پلو ڈالے رو رہا تھا کھڑکیوں کی پھٹی پھٹی آنکھیں تھیں جہاں جہاں ہم بیٹھتے تھے وہاں وہاں عبرت بیٹھی تھی- گھر سجانے کے سارے شوق خاک پوش فرش نشین سر جھکائے آنسو بہا رہے تھے اور ویرانی کیکلی ڈالتی تھی

اچھا چھوڑو

مزے کی بات یاد آگئی وہ دن جب بھائی خالد نے خوب فول بنایا تھا

بھائی خالد کو ہم فول بناتے رہتے، تھے وہ بھی بدلہ چکاتے رہتے ان دنوں ہم اپنی permanent oppiontment کے آرڈرز کا شدت سے انتظار کر رہی تھیں مارچ کا مہینہ تھا بھائی خالد ایجوکیشن آفس سے تقرری کے آرڈر لائے ان کے ہاتھ میں سچ مچ کے ٹائپ شدہ آرڈر دیکھ کر ہم خوشی سے دیوانی ہو گئیں طلعت کی تقرری گرلز ہائی سکول سیت پور تھی جو بہت دور تھا مگر میری تقرری بالکل قریب کے سکول مین تھی امی شکر ادا کرنے لگیں مبارک سلامت ہوئی، مٹھائی کھلاؤ، کا تقاضا ہونے لگا امی نے کہا جاؤ اندر سے میرا پرس اٹھا لاؤ بھائی خالد فوراً بولے میں تو دینہ بہن سے کھاؤں گا میں اپنے پیسے لے آئی مٹھائی آگئی تو جناب بتایا گیا کہ یہ تو فول تھا پہلے حیرت پھر دکھ پھر غصہ اور پھر ہنسی آئی خوب قہقہے لگے طلعت اس میں شامل تھی یہ بھی کھلا:

کیسا زندہ شخص تھا موت نے اس کو مار دیا

میری ماں (مرحومہ) کا دل پسند داماد (مرحوم) نہ خالد رہا نہ طلعت رہی یہ جنوں رہا نہ پری رہی-

بی ایڈ کا امتحان ہم دونوں نے ایک ساتھ دیا
تھا سترہ دن ہاسٹل میں رہے تھے جسے ایک
امتحان فیلو نے سترہ روزہ پاک بھارت
جنگ کا نام دیا تھا ہاسٹل میں بہت بڑے
ہال میں سب لڑکیوں کے بیڈ لگے تھے ساتھ
ایک میز کرسی میز کے نیچے اٹیچی رکھ دیے گئے
ہم دونوں کے بیڈ ساتھ ساتھ تھے سامنے بڑی
سی کھڑکی تھی جو کالج گراؤنڈ میں کھلتی تھی جہاں
مہندی کے پودے سفید پھولوں والے درخت
اور بہت سا سبزہ تھا کھڑکی کے شیشوں پہ صبح
کے وقت شبنم کے قطرے پھسلتے دکھائی دیتے
یخ سردی میں لحاف لپیٹ کر منہ نکالے پڑھتے
ہوئے سرخ گول سورج کو طلوع ہوتے دیکھنا
اور سوچنا سحر ہوگئی اب ناشتہ اور تیاری کرنے
اُٹھنا ہے
وہ ہم تھیں- دبلی پتلی لڑکیاں— جنم جنم کی
سہیلیاں—
یوں تو ہم پانچ بہنیں تھیں ایک تو بہت پیچھے
کم عمری میں چل بسی چار کا ساتھ چلتا رہا
ایک چولھے کا ساتھ شادیاں ہوگئیں تو دور ہو
گئے مگر طلعت کے ساتھ معاملہ جدا رہا ہم
سکول میں ساتھ جاتی تھیں پھر کالج میں
الگ ہوگئی مگر بی ایڈ میں ساتھ پھر ایم اے
انگلش، ساتھ مل کر نوٹس شیئر کر کے کیا پھر
جاب میں جدا ہوئے تو کرتے کراتے پھر
ایک ہائر سیکنڈری سکول یکجا ہوگئے وہ پرنسپل
میں سبجیکٹ سپیشلسٹ -- پھر دونوں گھر
قریب قریب بن گئے اور پڑوسن بن گئی ہم
کلاس فیلو کولیگ افسر ماتحت پڑوسن ہر تعلق
میں بندھی
بات کو سمیٹتی ہوں ورنہ تو عمریں گزر جائیں
باتیں ختم نہ ہوں
گرلز ہائی و نارمل سکول مظفر گڑھ میں طلعت
نہم میں تھی میں شاید ہفتم سے ابھی ابھی ہشتم
میں آئی تھی مینا بازار اور سالانہ ڈرامے کے
دن تھے شیکسپیئر کی نظم stages of
life پہ ٹیبلو کیا گیا تھا پہلا کردار ہی طلعت کا
تھا وہ نرس بنی تھی نرس کا سفید لباس پہنا تھا
بال سمیٹ کر کیپ نما سکارف لیا تھا ایک گڑیا
کپڑے میں لپیٹ کر گود میں لیے سٹیج پر
نمودار ہوئی۔

And allthe men and
women merely players
They have their exits
and their entrances

دردانہ بھاگ کر آو -- تمھاری بہن وہ
دیکھو— اور میں جس نے یونیفارم کا سرخ
کوٹ پہنا ہوا تھا سیب جیسے سرخ گال تھے
دو چوٹیاں کرتی تھی سٹیج پہ طلعت کو دیکھ کے
دنیا فتح کر لینے کی خوشی تھی کتنا سوہنا من
موہنا دل دھڑکاتا دن زمانہ دور تھا
چلو گھر چلیں طلعت، چھٹی ہوگئی
آو دوڑ لگاتے ہیں
جو پہلے پہنچا وہ جیتا
---اور تم جیت گئی

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

وہ ایک روبوٹ

عابر صاحب کی انتھک اور دن رات کی محنت کامیاب ہو چکی تھی۔ انھوں نے اسے غور سے دیکھا۔

وہی قد کاٹھ، وہی شکل و صورت، وہی نین نقش!

وہ فرطِ جذبات سے اس کے گلے لگ گئے۔

"تم اب ہمیشہ میرے ہمراہ رہو گے، میں تمھیں کبھی خود سے الگ نہیں ہونے دوں گا!"

عابر صاحب اسے خود سے بھینچے کہہ رہے تھے۔

"ابو! میں آپ سے الگ ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔" آواز بھی وہی تھی۔ اس آواز نے عابر صاحب کے کانوں میں رس گھول دیا۔

"تم نے مجھے ابو کہا؟!" عابر صاحب شادمانی سے چہکتے ہوئے بولے: "مجھے دوبارہ ابو کہو!"

"ابو!!!" یہ سُن کر عابر صاحب کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے۔

اڑھائی سال قبل ایک گاڑی نے عابر صاحب کی اکلوتی اولاد نوفل کو ٹکر مار دی، ہسپتال تک لے جاتے ہوئے نوفل کا انتقال ہو گیا۔ نوفل بائیس سال جی سکا تھا۔ نوفل کا انتقال عابر صاحب کے لیے ایک ایسا صدمہ تھا جس نے ان کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ نوفل کے سوا ان کا اس دنیا میں اور کوئی نہیں تھا، ان کی اہلیہ اس وقت وفات پا گئی تھیں جب نوفل صرف چھ ماہ کا تھا۔ نوفل کو انھوں نے مشکل سے پالا پوسا تھا۔ انھوں نے دوسری شادی اس لیے نہیں کی تھی کہ کہیں نوفل پر سوتیلی ماں ظلم و ستم نہ کرے!

نوفل کی وفات کے بعد وہ کھوئے کھوئے رہتے، وہ تنہا ہو گئے تھے۔ نوفل کی موت کا صدمہ انھیں سکون نہ لینے دیتا۔ وہ ایک قابل اور جانے مانے انجینئر تھے۔ وہ روبوٹس بنانے میں ماہر تھے، وہ کئی روبوٹس بنا چکے تھے۔ انھوں نے کچھ سوچا اور خلوص سے ایک روبوٹ بنانے میں جُت گئے۔

انھوں نے روبوٹ بنا لیا۔ وہ روبوٹ ہو بہو نوفل کی طرح تھا۔ انھیں لگا کہ اب ان کا بیٹا واپس

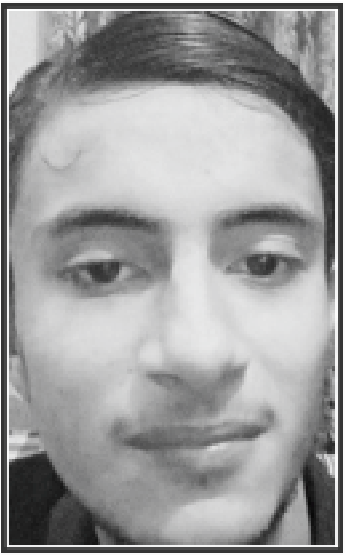

سلمان یوسف سمیجہ

آ گیا ہے، ان کی زندگی میں بھی بہار آ گئی۔ وہ روبوٹک نوفل سے اخلاص رکھتے۔ روبوٹک نوفل ہر وقت ان کے ساتھ رہتا، ان کے کام بھاگ بھاگ کر کرتا، انھیں وقت پر دوائی دیتا، انھیں شام کو پارک میں سیر کرانے لے جاتا۔ نوفل جب زندہ تھا تو وہ بھی اسی طرح ان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

"آپ اپنا بالکل بھی خیال نہیں رکھتے، آپ کو اپنا مکمل خیال رکھنا چاہیے!" جب عابر صاحب ذرا لاپرواہی کرتے تو روبوٹک نوفل مصنوعی خفگی سے کہتا۔

"میرا خیال رکھنے کے لیے تم ہو ناں!" عابر صاحب شفقت سے مسکرا دیتے۔

"ہاں! میں ہمیشہ سائے کی طرح آپ کے پاس رہوں گا۔" روبوٹک نوفل ان سے لپٹ جاتا۔

وقت گزرتا اور تبدیل ہوتا رہا، وقت کے ہمراہ روبوٹک نوفل میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں، یعنی اس کا سسٹم اپ ڈیٹ ہوتا رہا۔ عابر صاحب اور نوفل پہلے سے بڑھ کر ایک دوسرے کا خیال کرتے۔

ایک روز روبوٹک نوفل، عابر صاحب کے سامنے ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات پہلے کی طرح سپاٹ نہیں تھے، بلکہ درد بھرے تاثرات چھائے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر عابر صاحب حیران رہ گئے۔

"کیا ہوا؟" عابر صاحب تعجب سے بولے۔

"مجھے ایک بات پتہ چلی ہے کہ میں آپ کا سگا بیٹا نہیں ہوں۔ بلکہ آپ نے مجھے کہیں سے گود لیا ہے یا بنایا ہے!" روبوٹک نوفل کی آواز سے دُکھ واضح تھا۔ عابر صاحب سکتے میں آ گئے۔

"یہ کیسی بات کر رہے ہو؟ تمہارے چہرے کے تاثرات اور آواز سے دُکھ کیوں جھلک رہا ہے؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟" عابر صاحب چلائے۔

"کیا یہ سچ ہے کہ میں آپ کا سگا بیٹا نہیں ہوں؟" روبوٹک نوفل نے دُکھ بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں، یہ سچ ہے!" عابر صاحب نے نظریں چُرا کر کہا۔

"اوہ!" روبوٹک نوفل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

عابر صاحب چکرا کر رہ گئے، انھیں حیرت کا زور دار جھٹکا لگا تھا۔ روبوٹک نوفل کی آنکھوں سے آنسو کیسے بہہ رہے تھے؟

"اس انکشاف سے مجھے شدید صدمہ پہنچا ہے، میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے!" روبوٹک نوفل نے روتے ہوئے کہا۔

"کک...... کیا؟ صدمہ؟ خون کے آنسو؟" عابر صاحب اسے جھنجھوڑتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں بولے: "تم ہوش میں تو ہو؟

یہ کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں پورے ہوش میں ہوں اور دُکھ میں مبتلا ہوں، آخر میرے بھی جذبات اور احساسات ہیں!“ روبوٹک نوفل مسلسل روتے ہوئے بولا۔

عابر صاحب اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے،انھوں نے اسے سینے سے لگالیا۔ روبوٹک نوفل کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

روبوٹک نوفل کے اندر انسانی جذبات آ گئے تھے۔یہ سب کچھ عابر صاحب کے لیے ناقابلِ یقین تھا،لیکن انھیں یقین کرنا پڑا۔ وقت اسی طرح آگے بڑھتا رہا۔ روبوٹک نوفل نے یہ تلخ سچ قبول کرلیا تھا کہ وہ عابر صاحب کا سگا بیٹا نہیں ہے۔

ایک دن روبوٹک نوفل بازار سے سودا سلف لے کر واپس آ رہا تھا۔ ایک تیز رفتار گاڑی چلتی ہوئی آئی اور اس کو کچلتی چلی گئی۔ وہ تو اپنے راستے پر ہی چل رہا تھا،لیکن وہ گاڑی والا بدمست ہوکر گاڑی چلا رہا تھا۔

اس کے ٹکڑے عابر صاحب تک پہنچائے گئے۔ یہ دیکھ کر عابر صاحب پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔ وہ ان ٹکڑوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ”میرا بیٹا...... میرا بیٹا“ کہہ رہے تھے۔ حقیقی نوفل کا انتقال بھی تو اسی طرح ہی ہوا تھا۔

انھیں روبوٹک نوفل کی وفات پر اتنا ہی صدمہ ہو رہا تھا، جتنا حقیقی نوفل کی وفات پر ہوا تھا۔

عابر صاحب نے کئی دفعہ اس کے ٹکڑے جوڑنے کی سعی کی، تاکہ وہ پہلے جیسا بن سکے، مگر وہ نہیں بن پایا تھا۔

عابر صاحب اب ہر وقت دُکھ میں مبتلا رہتے۔ ایک دن ان کے ہاتھ روبوٹک نوفل کی ایک ڈائری لگی۔

انھوں نے اسے کئی بار ڈائری لکھتے دیکھا، تاہم کبھی استفسار نہیں کیا کہ ڈائری میں کیا لکھتے ہو۔ آج انھوں نے ڈائری پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ پڑھنے لگے۔ ڈائری میں روبوٹک نوفل نے بار بار ایک خواب کا ذکر کیا تھا کہ وہ غریبوں کے لیے ایک ویلفیئر ٹرسٹ بنانا چاہتا ہے۔

”انسانوں میں انسانیت تقریباً ختم ہوگئی ہے، لیکن ایک روبوٹ میں انسانیت موجود تھی۔“ عابر صاحب نم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے مسکرا دیے۔

عابر صاحب نے روبوٹک نوفل کے اس خواب کو پورا کرنے کا تہیہ کرلیا۔ کچھ ماہ بعد انھوں نے ”نوفل عابر ویلفیئر ٹرسٹ“ قائم کرلیا اور انسانیت کی خدمت شروع کردی۔ وہ روبوٹک نوفل کا خواب پورا کر کے اور انسانوں کے کام آ کر بے حد خوش تھے۔ انھیں سکون میسر ہوگیا تھا۔

☆☆☆☆☆

بٹوارا

ساتوں بھائی سر جھکائے اپنے باپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا سب سے چھوٹا بھائی اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ یہ آٹھ بھائی اور پانچ بہنیں تھیں۔ ایک بہن سب سے بڑی تھی۔ باقی سب بھائیوں سے چھوٹی تھیں۔ ان ساتوں کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ انھیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے انھیں ابھی سزائے موت سنا دی جائے گی اور ان کے بیوی، بچے حالات اور معاشرے کی ٹھوکریں کھانے کے لیے رہ جائیں گے۔ ان کا باپ بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے کندھے زمانے کے تند و تیز جھونکوں سے ٹکرا ٹکرا کر ناتواں ہوتے ہوتے اب جھک چکے تھے۔ ان بہنوں میں سے آج سب سے بڑی بہن کی بابت باپ نے انھیں بلا رکھا تھا۔

"دیکھو بھئی! میں نے آج تم لوگوں کو یہاں چند ضروری باتوں کے لیے بلایا ہے۔" ان کا باپ بولا۔

"کہیے ابا جی! ہم سن رہے ہیں۔" بھائیوں میں سے سب سے بڑا بولا۔

"بیٹے! وہ، اصل میں بات کچھ یوں ہے......" ان کا باپ ہچکچاہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ وہ سب خاموش نظروں سے باپ کا جھکا ہوا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ بات سب کو سمجھ آ رہی تھی لیکن سبھی حروف کو الفاظ کی شکل دینے سے گریزاں ہو رہے تھے کہ مبادا وہ بلی کے بکرے ہی نہ بن جائیں۔ بیٹوں کو ہنوز خاموشی مبتلا دیکھ کر وہ مدعا زبان پر لانے پر مجبور ہو گیا۔

"بچو! دیکھو! میرے کندھے اب جھک چکے ہیں۔ میں نے اور تمھاری ماں نے محنت مزدوری کر کے اور اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر تمھیں پڑھایا، لکھایا اور تم سب کی شادیاں کر کے تمھارے گھر بسا دیے ہیں۔" بوڑھا باپ ابھی بول ہی رہا تھا کہ ان میں سے بڑا بیٹا بول اٹھا۔

"ابا جی! یہ تو سبھی ماں، باپ کرتے ہیں۔ آپ تمہید چھوڑیں اور مطلب کی بات کریں۔" بڑا بیٹا تیزی سے بولا۔

بابر امین ابر

”بیٹا! تمھاری شادیوں کے سلسلے میں تمھاری بڑی بہن نے بھی میرا بڑا ساتھ دیا ہے اور یہ جو نوکری آج تم کر رہے ہو۔ یہ بھی تمھاری بہن ہی کی دین ہے۔ تمھارا بیڑا پار لگاتے لگاتے، اس کے بالوں میں چاندی اتر آئی ہے۔ اب خدا خدا کر کے اس کے لیے ایک اچھا رشتہ ملا ہے تو تم سب مل کر اپنی بہن کو اس کے گھر کی کر دو۔ پھر اس سے چھوٹی بیٹیاں بھی تو ابھی بیاہنی ہیں۔“ بوڑھے باپ نے بڑے بیٹے کو تھوڑا سا آئینہ دکھاتے ہوئے مدعا آخرکار طشت ازبام کر دیا۔

”ابا جی! وہ آپ کی مجبوری تھی اور بڑی بہن نے بھی اپنے بڑے ہونے کا فرض نبھایا ہے۔ پھر میں بھی آپ سب کو اس ڈربے سے نکال کر یہاں لے آیا ہوں۔ کیا یہ کم ہے؟ اور اب ویسے بھی میرے بیوی، بچے ہیں۔ مجھ میں اب گنجائش کہاں ہے؟“ بڑے بیٹے نے صاف صاف اپنا پلو بچاتے ہوئے کہا۔ حالانکہ حقائق اس کے برعکس تھے اور وہ اپنی بیوی کی پڑھائی پٹی بول رہا تھا۔ اس کی بات پر بوڑھے باپ کا دل جیسے دھک سے رہ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ ڈالا ہو۔ اس نے پھر بھی ہمت کر کے دوسرے بیٹوں کی جانب دیکھا تو وہ سب بھی یوں مظلوم و مجبور نظر آئے کہ باپ کا سانس لینا بھاری ہوتا چلا گیا۔

”ابا جی! یوں کر لیتے ہیں کہ باجی کی شادی کا خرچ بانٹ لیتے ہیں۔ میں بیس ہزار روپے دے دیتا ہوں۔ باقی یہ کر لیں۔“ بڑے بیٹے نے دوبارہ کہا۔

”ابا جی! میں تو محنت مزدوری کرتا ہوں۔ مجھ میں اتنی استطاعت نہیں ہے۔ مجھے معاف ہی رکھیے۔“ بڑے سے چھوٹے بیٹے نے کہا اور اس سے چھوٹوں میں سے کسی نے پانچ اور کسی نے بس دعائیں ہی دینے پر انحصار کیا۔ ان سب کے جوابات سنتا بوڑھا باپ یوں ہوتا جا رہا تھا جیسے خزاں رسیدہ پتا۔ وہ جیتی جان اور کھلی آنکھوں سے اپنی بیٹی کا بٹوارہ ہوتا دیکھ رہا تھا۔ ابھی اس کی چار بیٹیاں باقی تھیں۔ اس بٹوارے پر دیوار کے ساتھ لگی بڑی بہن کی آنکھوں سے آنسوؤں کا اک سیلِ بے کراں رواں ہو چکا تھا۔ بیمار بوڑھی ماں کو لپٹائے وہ دوسرے کمرے میں گھس گئی۔ چھوٹی بہنیں بھی دل برداشتہ ہو کر

ماں اور بڑی بہن کے پیچھے ہولیں لیکن کسی کو خبر نہ ہو سکی کہ ان کا سب سے چھوٹا بھائی نجانے کب کا آیا، اس بٹوارے کی داستان سن چکا تھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کمرے داخل ہوا۔

"مجھے تم لوگوں کا یہ بٹوارا تسلیم نہیں ہے۔ تم میں سے کسی کو بھی آپی کو بانٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ماں، باپ، بہنوں کو بے آسرا مت سمجھو۔ میں ہوں ناں۔ میں خود ہی آپی کی شادی کا انتظام کرلوں گا۔ تم باپ کا دکھ بانٹنے آئے تھے یا بٹوارے کا بوجھ اس پہ لادنے۔" سب سے چھوٹا بھائی اپنے بڑے بھائیوں پر برس پڑا۔

"ہاں! ہاں! بڑے شوق سے۔ ہمارے اپنے ہی جھانجے بکھیڑے بہت ہیں۔ ہم کسی اور جھمیلے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔" منجھلے سے چھوٹا بیٹا بولا تو اس کے الفاظ کی کاٹ نے جیسے باپ کا دل و دماغ سن کر ڈالا۔ یہ الفاظ نہیں زہر تھا، جو انھوں نے بوڑھے باپ کی رگوں میں انڈیل دیا گیا تھا۔ چھوٹے بیٹے کا چہرہ بھی غصے سے سرخ ہو چکا تھا۔

"تم، تم، میرے بچے نہیں ہو سکتے۔ مجھے خبر ہی نہ ہو سکی کہ میں اپنی آستینوں میں ان سانپوں کو پالتا رہا، جو آج ایک ساتھ مجھے ڈس گئے۔ شاہ میر! پتر! ان سانپوں کو نکال یہاں سے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے سانس نہیں آرہا ہے۔" بوڑھے باپ نے اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے تکلیف بھرے لہجے میں اپنے سب سے چھوٹے بیٹے سے کہا۔ باپ کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ بڑے بیٹوں نے باپ کو سنبھالنا چاہا لیکن چھوٹے بیٹے نے منع کر دیا۔

"تم اپنا بٹوارا کر چکے۔ اب یہ میرا حصہ ہے۔ میں خود ہی انھیں دیکھ لوں گا۔" چھوٹے بیٹے شاہ میر نے کہا اور باپ کو بازوؤں میں اٹھا کر وہ جلدی سے گھر سے نکلتا چلا گیا۔

دوسرے بھائیوں نے کچھ دیر تک ایک دوسرے کو دیکھا پھر ایک دوسرے کے پیچھے گھر سے نکلتے چلے گئے۔

ادھر بہنیں بھی ماں کی بگڑتی ہوئی حالت کو دیکھ کر اپنے تئیں اسے سنبھالنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے میں مصروف تھیں۔ کیوں کہ زہر تو اس کے رگ و پے میں بھی بیٹی کا بٹوارا ہوتا دیکھ کر سرایت کرتا جا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

کاروبار اپنی جگہ

(مائکروف)

دکان میں داخل ہوتے ہی میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وی سی آر، ٹی وی اور موٹی کیسٹوں والی فلمیں کرائے پر ملا کرتی تھیں۔ ہاسٹل کے دوستوں نے مجھے اور عمیر کو اسی مہم پر مارکیٹ بھیجا تھا۔ ہم نے یہ سب چیزیں ایک بڑی چادر میں لپیٹ کر ہاسٹل کے اندر پہنچانی تھیں۔ رات کو سب نے ایک کمرے میں جمع ہو کر فلمیں اڑانی تھیں۔ ایک لڑکے نے بائیں آنکھ میچ کر عمیر سے کہا:

”یار ایک وہ والی فلم بھی.....“ عمیر نے اچھا اچھا کہہ کر اس کی بات کاٹ دی۔

ہم نے موٹر سائیکل کھڑی کی اور فلم شاپ میں داخل ہو گئے۔ شیلفوں میں لاتعداد فلمیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ اردو، پنجابی، انڈین، پاکستانی انگریزی۔

چاروں طرف نظر فریب پوسٹر اور ایمان شکن تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ انہی منظروں کے بیچ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا ادھیڑ عمر دکان دار مقدس کلام کی تلاوت میں مشغول تھا۔

میں تو شرم سے پانی پانی ہو گیا لیکن عمیر سدا کا گھامڑ۔ چھوٹتے ہی کہنے لگا

”ایک وی سی آر، یہ دو انڈین فلمیں اور ایک ون ٹو تھری والی فلم---“

مجھے یوں لگا جیسے ابھی عمیر کو ایک زوردار تھپڑ لگے گا۔ میں آنکھیں بند کر کے زناٹے دار تھپڑ کی آواز کا منتظر رہا لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

دکاندار نے مقدس کتاب بند کر کے احترام سے ایک طرف رکھی، ہمارا مطلوبہ سامان کاؤنٹر پر رکھ کر ایک شیلف کو ہٹایا۔ خفیہ خانے سے خفیہ چیز برآمد کی اور پھر ایڈوانس کرایہ، سکیورٹی کی رقم وصول کر لی۔

جب ہم سارا مال کپڑے میں باندھ رہے تھے، دکاندار اطمینان سے عبادت میں مصروف ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

شہزاد نیّر

عبادت [افسانچہ]

عاصم بخاری

’’بہت اچھی بات ہے
زاہد یار، اس بات پر تمھیں داد دینا بنتا ہے‘‘
میں نے ستائشی لہجے میں کہا
’’کس بات پر۔۔۔؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔‘‘
فرض تو فرض ہیں تم تو نفلی روزے بھی باقاعدگی سے رکھتے ہو‘‘
’’بس یار یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے عبادت کا شوق دل میں ڈال دیا ، ورنہ بندے کی کیا اوقات؟
’’لیکن۔۔۔ ایک بات کہوں۔۔۔ اگر برا نہ مانو تو ‘‘
’’ہاں ہاں کہو۔۔۔ ؟
رزق حلال کمانا بھی عبادت میں شمار ہے یا نہیں
بالکل ہے، یہ تو بچے بچے کو پتہ ہے کہ رزق حلال عین عبادت ہے
’’کاش۔۔۔ آپ رزق بھی حلال کما کر یہ عبادت کرتے ‘‘
میں جھجکتے ہوئے کہا
’’کک۔۔ کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں‘
’’ڈیوٹی پر باقاعدگی سے جاتے ، یوں گھر بیٹھے تنخواہ نہ وصولتے‘‘

☆☆☆☆☆

نقل سے نقل مکانی تک

بیگم پر اپنی تعلیمی برتری اور رعب جمانے کی خاطر حسب معمول کوئی خاص خبر نہ ہونے کے باوجود بھی صبح ناشتے کی میز پر اخبار پڑھنے میں مصروف تھا کہ ایک خبر نے دھیان کھینچ لیا ''امتحانات میں نقل پر مکمل اور مستقل پابندی''.........؟؟

میرے ہونٹوں پر اِک مبہم سی مسکراہٹ پھیل گئی کیوں کہ اکثر لمبی لمبی چھوڑنے والے کبھی کبھار اتنی لمبی چھوڑ دیتے ہیں کہ بعد میں بات کو سنبھالنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔

اسی اثنا میں بیگم صاحبہ نے بھی محسوس کیا تو پوچھ لیا ''ارے میاں! ہمیں بھی تو پتہ چلے، چپکے چپکے مسکرانے کی وجہ.....؟'' شاید وہ اپنے عورت ہونے کا ثبوت دے رہی تھی تبھی تو اخبار کے سامنے میرا مسکرانا برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔

میں نے ہڑبڑا کر جلدی سے کہا ''بیگم! ہم سب اُمید سے ہیں''۔

بیگم نے دونوں ہتھڑ اپنے سینے پر مارتے ہوئے بلند آواز میں کہا ''ہائے میں مرگئی، اتنی بے تکی باتیں تو نہ کیجیے''۔

لیکن اگلے لمحے خود کو سنبھالتے ہوئے وضاحتی لہجے میں کہا ''اس بار امتحانات میں نقل بازی کی بجائے قلم بازی ہوگی۔

بیگم نے منہ بسورتے ہوئے کہا ''نقل اور پابندی......؟؟ ارے یہ تو نہ ماننے والی بات ہوئی، اگر اس ملک سے نقل کا رواج اُٹھ گیا تو یہ ملک ترقی کرنا ہی بند کر دے گا''۔

بیگی باتیں سُن کر میں بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ واقعی بھلا وہ کونسا امتحانی ہال ہوگا جہاں نقل نہ ہوتی ہوگی، طلبا و طالبات اور سہولت کار نقل سے یارانہ نہیں رکھتے ہوں گے۔ ہزار ہا اس کی کی مخالفت کی جائے اور اس کے تدراک میں تدابیر اختیار کی جائیں لیکن اس کے عادی اور سہولت کار اپنا اُلو کسی نہ کسی طریقے سے سیدھا کر ہی لیتے ہیں۔ نقل کے مارے کو نقل کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ اس کا نشہ بھنگ کی طرح ذہن اور عقل و شعور کو منجمد

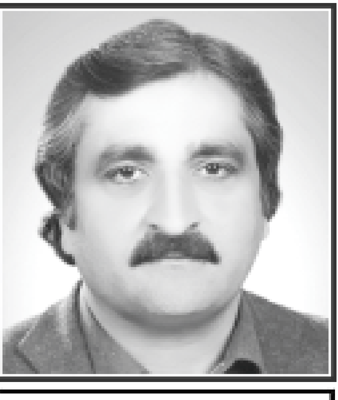

ہمایون خان

کر دیتا ہے۔ نقل کمبخت بذاتِ خود اتنی مست اور پُر خمار ہوتی ہے کہ اس کو اگر خود سے ہم کلام ہونے کا موقع مل جائے تو اس طرح گنگنانے لگی کہ "میں چیز بڑی ہوں مست مست، میں چیز بڑی ہوں مست مست" البتہ اگر نقل کو کبھی اپنے حق میں کچھ کہنا پڑے تو خود کو بے ضرر کہے گی اور ہمارے دماغی توازن کو غیر حاضر کہے گی۔ ہر سطح کے امتحان میں نقل کے سہولت کار اور متوالے اپنے ہتھکنڈوں میں مصروفِ عمل جبکہ پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں اس کا ردِعمل ہوتا ہے۔ لیکن طلبا کی منفی رہنمائی اور اپنے لیے رسوائی کما رہے ہیں۔ موقع کی مناسبت سے طلبا کی آنکھیں چار اور ہم جیسے سفید پوشوں کی زبانیں لاچار ہو جاتی ہیں۔ نقل کا یہ میٹھا زہر طلبا کو گمراہی، معاشرے کو منفی رُجحانات اور قوم کو تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ طلبا لکیر کے فقیر رہتے ہوئے حسبِ ضرورت اور حسبِ خواہش لکیر پیٹتے رہتے ہیں۔ ایسے میں ہمارے دلِ ناتواں اور دلِ ناداں نے اس نقلی پریشانی سے نقل مکانی کی سوجھی ہے۔

نقل سے واسطہ رہا نقل مکانی تک
کبھی ہنستا کبھی روتا رہا جوانی تک
نئی نسل کس طرح محفوظ رہے اس لعنت سے
سوچ سوچ کے حیران ہوں حیرانی تک

....

نقل کے بھی اپنے اپنے طریقے ہوتے ہیں۔ نقل کے بعض قدیم طریقے تو آج بھی رائج ہیں جس میں حرف "ج" سے شروع ہونے والے طریقے مثلاً جیب، جُراب، جیکٹ اور جرسی وغیرہ کو استعمال میں لاتے ہوئے نقل سے مستفید ہونا۔ بعض طلبا تو ازار بند سے نقل باندھ کر بہرہ مند بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ قدیم طریقوں میں تحریری نقل، زبانی نقل، اشاریاتی نقل، کنایاتی نقل اور پرزہ جاتی نقل آج بھی عروج پر ہے۔ اب تو ماڈرن دور ہے اور نقل کے جدید طریقے بھی عام ہو چکے ہیں۔ جن میں موبائل، بلیو ٹوتھ، سمارٹ واچ، سائنٹیفک کلکولیٹر شامل ہیں۔ تعلیمی اداروں کے بعض نااہل سربراہان "علم بڑی دولت" ہے میں صرف دولت کے حصول کے لیے دن دوگنی رات چوگنی کیے ہوئے ہیں جبکہ بعض والدین اور سہولت کار علم کے حصول کو جس کی لاٹھی اُس کی بھینس پر ہانک رہے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امتحان سے قبل ہی طلبا نقل کی خریداری اور اپنی ذمہ داری قبول کر لیتے ہیں۔ یہیں سے نقل کا فیشن اور مائیکرو فوٹو سٹیٹ کا کمپیٹیشن شروع ہو جاتا ہے۔

آج کے طلبا گواہ چست اور مدعی سُست کے سانچے میں پرورش پا رہے ہیں۔ کاہلی، سُستی اور کام چوری کی روش اپنا کرتن آسان بن چکے ہیں۔ وقت کے ضیاع کے بعد امتحانی ہال میں ٹانگیں کانپنا اور بغلوں میں جھانکنا ان کا معمول بن چکا ہے۔ تعلیمی سطح پر محنت، مطالعے کی لگن اور تحقیق کے فن سے ان کا سایہ بھی دور بھاگتا ہے۔ کتاب سے دوری اور

موبائل کی مجبوری ان کو اپنے مقاصد سے کہیں دور لے جا رہی ہے۔ ایسے موقع شناس اور آرام طلب طلبا کو جب نقل کی سہولت میسر آ جائے تو ان کے لیے سونے پہ سہاگہ اور نقل پرڈا کہ آسان ہو جاتا ہے۔ دورانِ امتحان یہی طلبا اتنی تیزی سے نقل رسانی کا کام سرانجام دیتے ہیں کہ دُنیا کی تیز ترین ٹیکنالوجی بھی ان کے سامنے ہاتھ جوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ آج کے طلبا عموماً و معمولاً امتحانی ہال میں ہاتھوں کی صفائی اور اپنی ڈھٹائی پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ امتحانی ہال کی کھڑکیوں، روشن دانوں اور غیبی امداد کے ذریعے نقل کی نقل و حمل جاری و ساری رہتی ہے۔

ہمارے محلے کے بزرگ اسرار بابو کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں پہاڑوں کی سلاجیت اور نقل میں طلباء کی جیت برابر فکر کی چیزیں ہیں۔ یہ بات کسی حد تک دُرست بھی ہے کیوں کہ یہاں زیادہ تر چیزیں درآمد ہوتی ہیں مگر واحد نقل ایسی چیز ہے کہ برآمد ہوتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری قوم اس میں کافی حد تک خودکفیل ہے۔ ہمارے دوست مظہر جاوید صاحب نے اس حوالے سے کیا بہترین عکاسی کی ہے:

بھلے تعلیم کی کردار کی قضا ہے چلی
الٰہی خیر ہو! پھر نقل کی ہوا ہے چلی
مجھے ڈر ہے میری نسلیں کہیں برباد نہ ہوں
مرے اس دیس کے آنگن میں جو وبا ہے چلی

نقل بازی اور نمبرات کے حصول کی دوڑ میں طلبا بعض والدین، اساتذہ اور سہولت کاروں کے مخصوص طبقے نے نہ صرف طلباء کے مستقبل کو داؤ پر لگایا ہوا ہے بلکہ طلبا خود بھی اپنی خوبیوں، صلاحیتوں اور خودی کا جنازہ نکال رہے ہیں۔ سہولت کار طبقے میں امتحانی عملے کا لطف و کرم اور طریقہ واردات باعثِ حیرانی و زبانی کچھ اس انداز میں ہوتا ہے کہ طلبا کو دورانِ امتحان کسی بھی آنے والے خطرات و مشکلات سے قبل از وقت باخبر رکھتے ہیں۔ طلبا کو مختلف علامتی لفظوں، اشاروں اور کنائیوں سے خطرے کی بابت سمجھاتے ہیں کہ اعلیٰ افسران کی اچانک آمد پر دفاعی اور ہنگامی اشارات اور بچاؤ کا اہتمام کس طرح کرنا ہے......؟

امتحان میں اعلیٰ افسران کی آمد، سموسوں اور پکوڑوں کی شامت، امتحانی دعوت کی لذیذ ابتدا ہوتی ہے۔ کھانے کی میز پر انواع و اقسام طعام اور امتحانی عملے کے لیے پُر تکلف اہتمام افطاری کے دسترخوان کی عکاسی کرتا ہے۔ چائے کا دور بھی کافی لذیذ ہوتا ہے اور یہی تو پہیلی ہے کہ ہر طالب علم پھر امتحانی عملے کا عزیز ہوتا ہے۔

نقل کوئی انوکھی بات نہیں اس کا رواج ہمارے ہاں بہت پہلے سے پروان چڑھا ہے ہمیں اپنا زمانہ امتحان اور بچپن سے جوانی تک کا تعلیمی سفر یاد ہے امتحان کے آغاز سے پہلے ہم بڑی معصومیت اور بھولی بھالی شکل و صورت لیے کسی

نہ کسی بیماری کا سہارا لے کر ایسی اداکاری کرتے کہ یہ ابتدائے نقل کی پہلی سیڑھی ثابت ہوجاتی۔ سردرد کا بہانہ، پیٹ کا مروڑ، معدے کا درد اور بے ہوشی طاری ہونا ایسے دفاعی گر تھے جس سے ہم پورے گھر کو پریشان وحیران کرتے رہتے۔ ہماری ایسی حالتِ بیماری پر ابا جانی کو مہربانی آجاتی اور امتحانی عملے کو مع پورے اعزاز کے ساتھ گھر پر دعوت طعام دی جاتی۔ پورا عملہ امی جان کے بنائے کھانوں کا لُطف اُٹھاتے اور ہم خوشی خوشی اپنے ساتھ گنگناتے۔ دورانِ طعام و مختصر قیام ابا جان بڑی خوش اخلاقی اور خوش مزاجی سے ہمارا تعارف کرواتے۔ ہم دُنیا جہاں کی معصومیت چہرے پر سجائے اُن کے سامنے دوزانو ہوکر ایسے بیٹھ جاتے جیسے آج کل کی خواتین جعلی پیروں کے روبرو مجبور ولاچار بن کر بیٹھتی ہیں۔ اس دعوتِ مہربانی سے ہمارا امتحانی سفر کافی آسان ہوجاتا اور امتحانی ہال میں ہماری معتبر حیثیت سب پر عیاں ہوجاتی۔ تب ہمیں دعوت کی اہمیت کا اندازہ ہوجاتا اور اس طرح ابا جانی کی دعوت کا اہتمام اور ہمارے نقل کا انتظام ہوجاتا اور صورتحال کچھ اس طرح ہوتی:

خوبیاں دعوت کی جب مجھ پر نمایاں ہوگئیں
میری ساری مشکلیں فی الفور آساں ہوگئیں
ممتحن سے جب کیا والد نے جا کر مُک مُکا
امتحاں کی مشکلیں سب میری آسان ہوگئیں

....

طلبا کی خوش نصیبی یا ہماری اور قوم کی بد نصیبی سمجھ لیجیے کہ ہمارے ہاں اساتذہ کا مخصوص طبقہ خود اس نقل بازی کے چکر میں اخلاقیات اور اپنی تدریسی صلاحیت اور ذمہ داروں سے رفو چکر ہوگیا ہے۔ نقل کے چسکے اور طلبا کے مسکے عموماً سہولت کار طبقے کو اپنی مٹھی میں کر لیتے ہیں۔ موجودہ دور کے اساتذہ کا یہ مخصوص طبقہ زچہ وبچہ کے مراکز کے دائی کی طرح طلبا کو بذاتِ خود نقل کی طرف راغب کر رہا ہے۔ یہی اساتذہ بسا اوقات ''عقل جمع نقل مساوی ہے پاس'' کا فارمولا طلبا کو باآواز بلند پڑھاتے اور سمجھاتے ہیں۔ حال ہی میں امتحانی عملے کے ایک سپرنٹنڈنٹ عملے کو کچھ اس انداز میں سمجھا رہے تھے کہ ''اگر میں عینک لگا کر ہدایات دوں تو اس کا مطلب ہوگا کہ آپ چوکس ہوجائیں۔ اس دوران اگر عینک کو حرکت دیتے ہوئے ناک پر لے آؤں تو سمجھ جائیں کہ مزید سختی کی ضرورت ہے۔ گلہ کھنکھار کر اگر عینک ماتھے کے اُوپر بالوں پر لے آؤں تو آپ طلبا کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں۔ ہال میں تیز تیز ڈگ بھرتے ہوئے عینک کے دونوں عدسوں کو پھونک مار مار کر صاف کروں تو یہ گرین سگنل ہوگا کہ آپ طلبا کو نقل کی کھلی آزادی دیں''۔ ایسے ہی سہولت کاروں اور موقع محل مہربانوں کے لیے بس اتنا عرض ہے:

ہر پرچے میں خبر ہے تیری پسپائی کی
ہر طرف تصویر چھپی ہے تیری انگڑائی کی
کیسے کہہ دوں کہ تو مُصلح کل اور سہولت کار بھی
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

☆☆☆☆☆

"حلوہ"

حلوہ کھانے سے مرد موٹے ہوتے ہیں اور عورتیں؟ ارے--- وہ تو پہلے ہی موٹی ہوتی ہیں- جو عورت زندگی بھر موٹی نہیں رہی وہ کبھی عورت ہی نہیں رہی--

خیر بات حلوے کی ہو رہی تھی --- حلوہ برصغیر پاک و ہند کا سب سے مشہور اور مرغوب پکوان شمار کیا جاتا ہے- پکانا آسان اور کھانا تو بے حد آسان - کیا بچے کیا بوڑھے اور کیا دند بوڑے-- سب ہی کھا سکتے ہیں-- ترکیب کچھ یوں ہے کہ سوجی اور شیرے کا باہم اتفاق اس طرح کیا جائے جس طرح ہماری نام نہاد سیاسی جماعتیں کسی ایک مسئلے پہ اکٹھی ہوتی ہیں- لیکن حلوے کو کان وکان خبر نہیں ہونی چاہیے -

خیر سیاسی جماعتیں نہ بھی اکٹھی ہوں --- حلوہ تو بن ہی جاتا ہے-

مثل مشہور ہے کہ جتھے حلوہ اوتھے مولویاں دا جلوہ---- جس کی وجہ سے ہمارے اکثر و بیشتر تنڈل مولوی شوگرا گئے ہیں-- لیکن مجال ہے کہ حلوے کو اس سے کوئی فرق پڑا ہو---

حلوہ ہر تہوار پہ پکایا جا سکتا ہے-- اس کے لیے وقت اور عمر کی کوئی قید نہیں-- یہی بات نکاح پر بھی صادق آتی ہے ---- لیکن تجربے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہمسایوں کے گھر سے آنے والے حلوے کا تو جواب ہی نہیں ہے---

اگر تاریخ کے اوراق کھنگالے جائیں تو معلوم ہوگا کہ حلوے نے کبھی کسی کا دل نہیں توڑا---

لوگ اسے کھاتے گئے، کھاتے چلے گئے اور کھاتے کھاتے کھسماں نوں کھا گئے---

سیدہ آمنہ ریاض

کہا جاتا ہے کہ مٹی کی خوشبو سے حب الوطنی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہمسایوں کے گھر سے آنے والی حلوے کی خوشبو سے زوجہ محترمہ کے مزاج شریف کا پتہ بھی چلایا جا سکتا ہے۔

ماضی کے اوراق کھنگالیں تو ادراک حاصل ہوتا ہے کہ آج تک حلوے کی وجہ سے کوئی جنگ نہیں ہوئی البتہ کم پکائے جانے پر بچوں کے درمیان ہونے والی گھمسن گھی جنگ اور ہتھو کھی ہونے کے مناظر کبھی شبیر نے نہیں دیکھے۔

سسرال میں نئی نویلی دلہن سے عموماً حلوہ بطور پہلی ڈش پکائے جانے کی مثالیں ہر دوسرے گھر میں موجود ملیں گی۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد حلوہ آپ کو نہیں ملے گا۔

کیونکہ

نہ تھا اگر تو شریک حلوہ قصور تیرا تھا یا کہ میرا

(روح اقبال سے معذرت)

حلوہ دنیا کے تقریباً سارے ممالک میں کھایا اور پکایا جاتا ہے۔ حیرت ہے پھر بھی عالمی اتحاد التوا کا شکار کیوں ہے؟

حلوہ کم خرچ بالا نشین ہونے کی بہترین مثال ہے۔۔ ایک مرتبہ اردو کے امتحان میں کم خرچ بالا نشین پر جملہ بنانے کو کہا گیا تو بیشتر بچوں نے محض حلوہ لکھنے پر ہی اکتفا کیا۔۔۔

بھئی بات تو سچ ہے مگر-----

ایک مرتبہ تیس روزے پورے ہو گئے لیکن مولوی حضرات کو چاند نظر نہ آیا۔۔ اس ضمن میں کسی مولوی شناس حلوائی سے رابطہ کیا گیا۔۔۔ سب سے پہلے سوجی کا حلوہ ان مولویوں کو کھلایا گیا۔۔۔ تو معلوم ہوا کہ ملک کے شمال سے چاند کی ایک شہادت کی خبر ملی۔۔۔ فوری طور پر ان مولوی صاحب کو گاجر کا حلوہ کھلایا گیا تو ملک کے مشرق و مغرب سے چاند کی شہادتیں موصول ہونا شروع ہو گئیں۔۔۔ آخر میں جب خالص دیسی گھی سے تیار کردہ دال اور بیسن کا حلوہ مولوی صاحب کے شکم گزار کیا گیا تو مکمل طور پر ملک کے تمام حصوں میں چاند نظر آنے کی اطلاعات موصول ہو گئیں۔۔۔ البتہ اتنی زیادہ مقدار میں حلوہ کھانے کے بعد مولوی صاحب نے جو چن چڑھایا اس کا ذکر کسی کتاب میں موجود نہیں۔

حلوے کی سجاوٹ کے لیے اس کے اوپر پستے کی ہوائیاں چھوڑی جا سکتی ہیں۔۔۔ اگر آپ کی اپنی ہوائیاں نہ چھوٹیں تو آپ چلغوزے کا بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

بہر حال کھاو تسی حلوے ماںڈے......ٹھنڈ
اونہاں دے پیڈ کرن جنہاں کھادیاں گاجراں

☆☆☆☆☆

''ٹوٹا ہوا چراغ''

رشید لاہور کے ایک علاقے میں واقع ایک چھوٹے سے گھر میں پیدا ہوا۔ والد سرکاری سکول کے استاد تھے، اور ماں گھر پر بچوں کی تربیت میں مصروف۔ رشید بچپن سے ہی ذہین تھا، ادب کا شوقین، ہر وقت کتابوں میں گم رہتا۔ کالج میں داخل ہوا تو ہر استاد اُس کی ذہانت کی تعریف کرتا۔

مگر جیسے ہی کالج میں نیا ماحول ملا، رشید بدلنے لگا۔ پہلے پہل دوستوں کے ساتھ بیٹھکیں، پھر سگریٹ، اور جلد ہی نشے کی لت۔ سب کچھ ایک تفریح کے طور پر شروع ہوا، مگر وقت کے ساتھ وہ رشید کی گرفت میں آ گیا۔

والد کی نگاہ میں رشید آج بھی وہی محنتی لڑکا تھا، مگر ماں کے دل کو کچھ کھٹکنے لگا تھا۔ رشید دیر سے گھر آتا، آنکھیں لال، بات بے بات غصہ۔

''کچھ نہیں ہوا ماں، بس تھکا ہوا ہوں...''

وہ روز یہی بہانہ بناتا۔

رفتہ رفتہ تعلیمی کارکردگی گرنے لگی، دوست بدل گئے، اور قرضے بڑھنے لگے۔ ایک دن والد نے اُس کی جیب سے نشے کی دوا برآمد کی۔

''رشید؟ یہ کیا ہے؟''

رشید خاموش رہا۔ اُس کی خاموشی سب کچھ بول گئی۔ والد نے غصے میں آ کر ہاتھ اٹھایا۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بہنیں اس کا نام سن کر کمرے سے چھپ جاتی تھیں۔

''تم نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا..'' باپ نے روتے ہوئے کہا۔

رشید ہر رات خود کو کوستا، لیکن نشہ اس کے جسم کی مجبوری بن چکا تھا۔ وہ علاج کے لیے تیار نہ تھا۔ اسے لگتا تھا وہ خود ہی چھوڑ دے گا، مگر وہ جال میں بری طرح پھنس چکا تھا۔

ایک سرد رات، جب رشید نے اپنا آخری سکہ بھی نشے کے لیے لٹا دیا، وہ سڑک کے کنارے نیم بے ہوش گر پڑا۔ اسی لمحے ایک ضعیف فقیر عورت اُس کے قریب آئی۔ وہ عورت دربار میں رہتی تھی، دوسروں کی جھوٹی سچی کہانیاں سنتی رہتی تھی۔ اُس نے چادر اتار کر رشید پر ڈال دی۔

''بیٹا، یہ دنیا تیرے جیسی بہت سی کہانیوں سے بھری ہے، مگر کچھ لوگ پلٹ بھی آتے ہیں۔ اگر تو چاہے تو ابھی بھی پلٹ سکتا ہے...''

یہ الفاظ اُس کے کانوں میں گونجتے رہے۔ رشید نے گھر لوٹ کر ماں کے قدموں میں سر رکھ دیا، روتے ہوئے کہا:

''ماں، اب مجھے بچا لو۔''

والد نے اُسے ایک اچھے بحالی مرکز میں داخل کروایا۔ ہفتوں کی قید، جسمانی تکلیف، نفسیاتی کشمکش... کئی بار رشید ٹوٹا، گرا، رویا، مگر وہ فقیر عورت کا جملہ یاد آیا:

''جب تک سانس باقی ہے، واپسی کا راستہ بھی باقی ہے۔''

دو سال بعد، رشید نے مکمل طور پر نشہ چھوڑ دیا۔ اب وہ دوسروں کو مشورے دیتا ہے۔ بحالی کے مرکز میں بطور رضا کار کام کرتا ہے۔ اُس کے لیکچرز میں نوجوان کان لگا کر سنتے ہیں، اور اکثر اُسے ''سر'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔

ایک دن اُس نے اپنی کتاب کے پہلے صفحے پر یہ جملہ لکھا:

''میں ایک ٹوٹا ہوا چراغ تھا... مگر کسی نے مجھے اپنی روشنی دے کر پھر سے جلایا۔''

☆☆☆☆☆

کومل شہزادی

نحیف ضعیف شریف اور مریض [خاکہ]

محمد کلیم

کچھ دو نام ہمیشہ اکٹھے آتے ہیں مثلاً طارق محمود، خرم شہزاد، صبح صادق، نوید انجم وغیرہ وغیرہ مجھے لگتا ہے کہ یہ نام رکھنے والے والدین اپنے بچوں سے زیادہ محبت کرتے ہیں اس لیے ایک وقت میں دو نام عطا کرتے ہیں تا کہ بچے زیادہ شاد و آباد رہیں یہاں اس بات کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے ان تمام ناموں کے لاحقے کے ان کے والد کے نام نہیں ہوتے ورنہ عمومی طور پر والد صاحب اپنا نام اپنی اولاد کے ساتھ لاحقے لگا دیتے ہیں تا کہ زندگی بھر معلوم ہوتا رہے کہ کس کے کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔

ایسے ہی نوید انجم میرے ایڈیشنل سیکرٹری بن کر تشریف لائے جن کا پورا نام محمد نوید انجم کھرل تھا کھرل ان کی ذات تھی لیکن اپنا نام محمد نوید انجم لکھتے تھے ذات کا تب پتہ چلا جب انھوں نے ایک دن اپنا ای میل ایڈریس دیا اور تاکید کی کہ ان کو ای میل کر دی جائے۔

ایک تو ان کی عادت تھی کہ وہ سکون سے بیٹھ نہیں سکتے تھے ہر شے میں جلدی کرتے لیکن پھر فائل منگوا کر تسلی سے اس پر کئی دن بیٹھتے کہنے والے کہتے ہیں وہ فیصلہ کرتے ہوئے گھبراتے تھے ہو سکتا ہے یہ بات درست ہو مگر فائل پر بیٹھنا ان کا معمول تھا سول سروس کی ایک خوبی ہے (ویسے تو ان کی کئی خوبیاں آپ عوام سے پوچھ سکتے ہیں) کہ ہر آفیسر دوسرے آفیسر کو جانتا ہوتا ہے مگر یقین کریں ہم نوید انجم کو بالکل نہیں جانتے تھے نہ جانے انھوں نے کس کونے کدرے میں نوکری کی تھی کہ ہم ان کو نہ جان پائے ورنہ معمول تو یہ ہے اکثر سے تعلق نہ سہی سلام دعا ہو جاتی ہے۔

وہ جون کے مہینے میں پینٹ کوٹ، ٹائی اور جرسی پہن کر تشریف لے آئے تو ہمیں ایک دفعہ ان کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا ویسے تو عمومی بابو پینٹ کوٹ اور ٹائی کا استعمال سارا سال کرتے ہیں یہ ایسے اچنبھے کی بات نہیں لیکن جس شے نے ہمیں یہ سوچنے پر مائل کیا وہ جرسی تھی جو انھوں نے اپنی شرٹ کے نیچے پہنی ہوئی تھی شرٹ کے نیچے سے اپنی جھلک کرا رہی تھی۔ وہ اتنے نحیف تھے

کہ اگر پنکھا تیز چلاؤ تو جھولنے لگتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انھوں نے کبھی اپنے کمرے میں پنکھا نہیں چلایا اور اپنے آپ کو اڑنے سے بچانے کے لیے پینٹ کوٹ ٹائی اور جرسی کا سہارا لے رکھا تھا۔ کچھ دنوں میں ہی ان سے گپ شپ ہونے لگی تو بتانے لگے ان کا وزن ماشاء اللہ پورا 47 کلو ہے اور قد چھ فٹ آپ خود سوچیں ذہن میں کیا تصور بنتا ہے یقیناً آپ کے ذہن میں ایک لاٹھی پر چند کپڑے ٹنگے نظر آئیں گے یا وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ جو کسی فلم میں ڈرانے کے لیے استعمال ہوتا ہے بس فرق اتنا ہے اس ڈھانچے نے پینٹ کوٹ ٹائی اور جرسی پہن رکھی ہے ایک دن ہم نے ان کی اتنی بے وزنی کے بارے میں پوچھ ہی لیا تو فرمانے لگے کہ ان کو آنتوں میں انفیکشن ہے۔ جس کی وجہ سے وہ گندم دودھ اور کئی دوسرے اجناس مثلاً انڈا وغیرہ نہیں کھا سکتے۔ اس لیے ان کا وزن مسلسل نیچے کی طرف رواں دواں ہے وہ دفتر میں پورے بیگ کے ساتھ تشریف لے آتے، جس میں ان کا کھانا چائے دودھ کے بغیر اور دوائیوں کی پوٹلی شامل ہوتی۔ بقول نوید انجم صاحب یہ انفیکشن انھیں 12 سال سے ہے کبھی بھی اللہ نہ کرے کینسر میں بدل سکتی ہے اس لیے احتیاط لازمی ہے ان کا رنگ سانولا بال گھنے اور چہرہ ڈاڑھی سے سجا ہوا ہے۔ بال اور ڈاڑھی برف کی طرح سفید جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ کبھی رنگ نہیں کیا گیا۔ عمر 57 سال تھی مگر 70 سے اوپر کے لگتے تھے کوٹ میں ہمیشہ کنگھی رکھتے تھے اور اس کنگھی کو گاہے بہ گاہے اپنی ڈاڑھی میں پھیرتے رہتے تھے اکثر ایسا ہوتا تھا کوئی میٹنگ بھی ہو رہی ہو تو وہ کنگھی نکالتے اور پھیرنا شروع کر دیتے ہیں۔

صبح صبح ضرور سیکرٹری صاحب کو سلام کرنے جاتے اکثر اپنے دفتر میں نہیں سیکرٹری کے پی اے کے ساتھ بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیشہ سیکرٹری صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتے اور ان کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کرتے ہمیں بھی تلقین کرتے سینیئرز کے آگے زیادہ نہیں بولنا چاہیے بس چپ کر کے حکم کی بجا آوری کرنی چاہیے ہم نے جب بھی ان کو دیکھا حالت رکوع میں دیکھا آپ وہ کام بھی کرتے جو نائب قاصد وغیرہ کے کرنے کے ہوتے ہم اکثر کہتے رہتے ہیں کہ آپ بیٹھیں کام ہو جائے گا لیکن وہ خود اٹھ کر کرنے لگتے ہیں ہمیں ڈاکٹر صاحب یا سر کہہ کر پکارتے ہیں ہم بھی سر کہتے ہیں وہ بھی سر کہتے ہیں اس طرح ہماری گفتگو میں اکثر و بیشتر سر کی سنچری ہو جاتی۔

ان کو سردی بہت لگتی تھی اس لیے جون میں پینٹ کوٹ پہن کر آتے پنکھا نہیں چلاتے اور

اے سی بھی بند رکھتے ہیں مگر جب کوئی میٹنگ لے رہے ہوتے تو 30 پر اے سی چلا دیتے ہم کہتے سر رہنے دیں کہتے ہیں نہیں یار مجھے سردی لگتی ہے لیکن تم لوگوں کا کیا قصور ہے کہ گرمی میں بیٹھو اس لیے چلنے دو میں برداشت کرلوں گا جب اے سی چل رہا ہوتا تو مسلسل گرم پانی پیتے رہتے ہیں تا کہ ان کو سردی نہ لگے اور ہاتھ رانوں کے نیچے دبائے رکھتے ہیں۔ خود کچھ بھی نہیں کھا سکتے تھے یعنی عموعی اشیاء اگر کھاتے تو کب کے کوچ کر جاتے۔ لیکن ہمیشہ دوسروں کے لیے بہترین چائے بسکٹ کا انتظام کرتے اور خود گرم پانی پیتے رہتے ہم ان کی منگوائی ہوئی ہے اشیائے خوردونوش پر خوب ہاتھ صاف کرتے۔ وہ پرانے زمانے کے ایم اے انگلش تھے وہ بھی ایف سی سے۔ اس لیے ادب سے شغف رکھتے تھے خود تو نہیں لکھتے مگر اچھے شعر اور نثر پر داد دیتے وہ بتاتے تھے کہ غلام جیلانی کامران ان کے استاد رہے ہیں اس لیے ان میں ادب کا ذوق پیدا ہوا جب ان کو معلوم ہوا میں بھی صفحے کالے کرتا ہوں تو مجھ سے کہا بھائی ہم بھی ادب کے طالب علم ہیں ہمیں بھی عطا کریں تو میں نے ان کو اپنی کتابیں بیکار سرکار اور زندگی تیری تلاش میں عطا کی زندگی تیری تلاش میں میری شاعری کی کتاب ہے جس کا انتساب میں نے اپنی زوجہ کے نام کیا ہے اکثر لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ آپ نے کتاب کا انتساب زوجہ کے نام کیوں کیا ہے کچھ کہتے ہیں تم اس کو خوش کرنا چاہتے ہیں تا کہ تمھارے دوسرے معاشقے ان پر منکشف نہ ہو جائے بہر حال جب انھوں نے یہ سوال مجھ سے کیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ نوید انجم بھی اس طرح سوچتے ہیں کہ محبوبہ جو ہے بیوی نہیں ہو سکتی یا شاید ان کو کتاب بیوی کے نام کرنا معیوب لگا (کیا ہم اپنا سب سے زیادہ وقت جس کے ساتھ گزارتے ہیں اس کے نام انتساب نہیں کر سکتے)

وہ اکثر مجھ کو بلا لیتے اور سیاست پر بات کرتے اور کہتے کہ تمھاری سیاست پر کافی بصیرت ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے لیکن میری پی ایچ ڈی کی ڈگری چغلی کھاتی ہے وہ زیادہ تر خاموش رہتے اور ایک سوال کر کے چھوڑ دیتے پھر میری رائے سنتے جب میں ان کو حمایتی پارٹی کے حق میں دلائل لاتا تو وہ عش عش کر اٹھتے اور جب میں دوسری پارٹیوں کے حق میں دلائل لاتا وہ میری رائے کے ان کے حق میں نہ جا رہی ہوتی تو ان کا چہرہ بتاتا کہ ان کو میری بات پسند نہیں آئی لیکن وہ کہتے کچھ نہیں ہم ابھی ان کے ساتھ کام کر رہے ہیں دیکھیں یہ ساتھ کہاں تک چلے اور ان کی کئی اور پرتے ہم پر کھلیں ہم بھی انتظار کرتے ہیں آپ بھی کریں۔

☆☆☆☆☆

شاعری کا راہی ــــ اُستاد جاوید قاسم بھائی

آج کا جاوید قاسم تقریباً تیس سال پہلے جاوید راہی ہوا کرتا تھا پھر اس نے رفتہ رفتہ فرداً فرداً کانوں کان اپنے تمام دوستوں کو اطلاع دی کہ اس کے ساتھ چلنے والا راہی جسٹس جاوید قاسم کے فوری فیصلے کے مطابق راتوں رات پھانسی پا چکا ہے اس لیے اب سہارے کے لیے بچے کھچے جاوید نے قاسم کو ساتھ لگا لیا ہے۔ سو، اب کوئی دوست جاوید کے ساتھ گلِ نوخیز قاسم کے دیکھے تو جاوید پر ذرا بھی شک نہ کرے کہ جاوید پہلے ہی راہی کی راہیت میں کافی بدنام ہو چکا ہے، جن دنوں جاوید قاسم راہی ہوا کرتا تھا اُن دنوں یہ اپنے حلیے سے راہی سے زیادہ راہزن لگتا تھا۔

ڈھیلی ڈھالی نیلی پیلی ڈبی دار قمیض سفید شلوار لٹکا ہوا کمر بند گریبان کے بٹن کھلے ہوئے۔ بھاری بوٹ، ہاتھ میں سگریٹ کی ڈبی پھر سگریٹ کا لمبا کش لگا کر کسی سردار کی طرح دیر تک کھانستا اسکو اور بھی پراسرار بناتا تھا۔ یہ ان دنوں صرف شاعری کرتا تھا، یا شاعری کے لیے ویگن کا سفر، سفر اور شاعری سے تنگ آتا، تو پھر سفر اور شاعری کرتا، ذرا فرصت ملتی تو کینٹ سکول آف تھاٹ کے سرغنہ شہزاد احمد، خلش بجنوری اظہار شاہین ذوقی مظفر نگری کے ساتھ ساتھ واجد اینڈ صادق گروپ آف شاعری کے پروپیگنڈہ سیکرٹری کے فرائض بھی انجام دیتا۔

جاوید قاسم، واجد امیر، صادق جمیل اور شبیر حسن کے ساتھ جا رہا ہو تو یوں لگتا ہے جیسے صاحب ثروت لوگوں کے ساتھ اپنی کھوتا

اعجاز رضوی

ریڈی کا قبضہ لینے جا رہا ہے۔ ایک وقت تھا
جب یہ شوق کے ساتھ ہائی نک اور کوٹ
پہنتا تھا۔ بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے
بالوں کو بہت احتیاط کے ساتھ پہلے کھڑا کرتا
پھر پھیلا دیتا، مگر پھر بھی کہیں کہیں سے گنج
نمایاں رہتا، آج دیکھیں تو یہ کہیں کہیں سے
بالوں والا لگتا ہے۔ ذرا غور سے دیکھیں اور
سے تو یہ کبھی کبھی بچوں والا بھی لگتا ہے۔ ایک
زمانے میں یہ غزل کہتا پھر پیدل چلتے
ہوئے جتنے بھی شاعر نظر آتے سب کو شعر
سناتا، بل کہ اکثر اس کام میں والٹن روڈ سے
چلتا اور اپنے اشعار پر خود ہی جھومتا جھامتا
ہوا پرانی انارکلی آ نکلتا اور وہاں آ کر پہلے
پھولے ہوئے سانس کے پوچھا، یار اے
دسو ایتھوں والٹن ول کوئی ویگن جاندی
اے، یہ اکثر شعر سناتے ہوئے یوں اُچکتا
ہے جیسے پیچھے کسی نے سوئی ماری ہو، مگر شعر
ایسے سناتا ہے کہ سب اُچک جاتے ہیں، یہ
کہتا، بھائی جی، سنو، شعر سنو،

اس سے پہلے کہ چراغوں کو ہوا لے جائے
روشنی جتنی ملے جس کو اٹھا لے جائے

اک گھٹن ہے گھروں کے اندر بھی
لوگ آتے نہیں چھتوں پر بھی
خشک رکھتا ہے اپنے پیروں کو
اور رستے میں ہے سمندر بھی

اک بار میں نے جس میں کھولی تھیں کھڑکیاں
کمرے سے تیرے نقش چرا لے گئی، ہوا

....

یہ جتنا زیادہ بیمار ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ
مشاعرے پڑھتا ہے جب اس سے کہا
جائے کہ یار جاوید قاسم ڈاکٹر نے تجھے آرام
کا مشورہ دیا ہے تو یہ کہتا ہے
تُسی گل ٹھیک کیتی جے، تہاڈی مہربانی پر
سر جی میری گل سنو
سنو، سنو، میری گل سنو، اے ڈاکٹراں نوں کی
پتہ میری اصل بیماری کی اے، دوسرا تسلی
کے لیے بولے تو کہتا ہے سنو تے، سر جی
میری گل تے سنو،
تُسی آپ دسو، خرچن واسطے پیسے نئیں، کھان
واسطے روٹی نئیں، پان واسطے کپڑے
نئیں، رہن واسطے مکان نئیں تے ہن
مشاعرہ وی نہ پڑھیے تے دسو کی کریئے
سوکھے سوکھے مر جائیے۔
جاوید قاسم نے آج تک کسی کو اپنا صحیح پوسٹل
ایڈریس کبھی نہیں بتایا، جب بھی اس سے
پتہ پوچھو کہتا ہے میرا پتہ کہڑا مشکل اے

لکھو، منا پان شاپ نزد مستری علم دین متصل شیخ کریانہ سٹور بالمقابل رشید گجر کچی گلی ہمسائے کول کر شاعر جاوید قاسم کینٹ والے کو ملے۔

جاوید قاسم آج تک کینٹ ایریا سے باہر نہیں نکل سکا۔ اس کا خیال ہے کہ کینٹ میں رہتے ہوئے بندہ اگر بُری شاعری بھی کرلے تب بھی فوج کی سکیورٹی موجود رہتی ہے۔ اس نے آج تک اعلانیہ ملازمت بھی نہیں کی۔ اس لیے کسی کو پتہ نہیں کہ یہ کب پروفیسر تھا، کب کلرک تھا کب افسر تھا اور کب اُن عہدوں سے ریٹائرڈ ہوا۔ اس نے اپنے روزگار کو شو آف کرنے کے لیے کئی بار کتابیں چھاپنے کا پروگرام بنایا شاید ایک دو بار کتابوں نے پریس کا منہ بھی دیکھا، کئی بار تو اس نے خود اپنی کتاب بھی چھاپنے کا ارادہ کیا اور رقم بھی جوڑ جاڑ کر الگ کرلی مگر پھر خود ہی اپنی رقم کھا گیا۔ پھر کافی عرصہ خود کو ہی تلاش کرتا رہا اس کی پریشانی دیکھ کر کسی نے کہا یار جاوید قاسم تو خود اپنی کتاب چھاپ لے تو بولا، سر جی میں بہت مہنگا پبلشر آں۔ میں کس طرح کسی غریب بندے دی کتاب چھاپ دیناں۔ جاوید قاسم مختصر بات کو بھی تقریباً چالیس منٹ میں مکمل کرتا ہے اس کا خیال ہے، چالیس منٹ کی لگاتار گفتگو سے بندہ پروفیسر لگتا ہے، جس وقت یہ کہے کہ دیکھیں جی سوچ جائیں کہ اب یہ نہیں دیکھے گا بس بولے گا۔ اور وہ بھی بولے کی طرح بولے گا یہ کہے گا،

جناب صدر بات یوں ہے کہ تقطیع کرلیں یا فٹے سے ناپ لیں مصرعہ اولا مصرعہ ثانی سے کچھ انچ کے فطری فاصلے سے ہٹ کر فصیلِ شاعری سے کود کر خودکشی کا مزاج رکھتا ہے۔

جاوید قاسم اب سے پہلے لوگوں کی بہت کم سنا تا تھا اور آج کل تو بلکل بھی نہیں سنتا یہ چلتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے پاؤں سے زمین ناپ رہا ہو۔ کہتے ہیں ہر خوش حال اور بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے بلکل اُسی طرح پاکستان میں ہر نکمے شاعر کے پیچھے جاوید قاسم کا ہاتھ ہے یہ بیٹھا ہوا ہو تو ہیرو لگتا ہے مگر جونہی چلتا ہے تو ولن لگنے لگتا ہے یہ ہر دس کلو میٹر والے مشاعرے میں جانے سے پہلے شلوار قمیض کے ساتھ کوٹ اور پھر کوٹ پر شاندار چادر کی بکل مار کر رکشا کو ہاتھ دیتا ہے پھر بغیر بھاؤ تاؤ کیے رکشا میں بیٹھ جاتا ہے اور پھر رکشا والا کو بتایا ہے کہ بھائی جی آج کل حالات

بہت خراب نیں، دسو رکشا تے بہہ کے مشاعرے پڑھن جانا کتنا خطرناک کم اے، بہرحال تُسی فکر نہ کرو، مشاعرہ دا منتظم مل گیا تے تہھوں پیسہ پورے ملن گے میری خیر اے، جے تُسی پیسے مینوں دے دیو تے تُسی وی مشاعرہ پڑھ لو، رکشا والا گھبرا کر کہے کے میں تے شاعر نہیں تو یہ کہتا ہے، او جہیڑے مشاعرہ پڑھن واسطے بیٹھے نیں او کیہڑے شاعر نے، تُسی ہمت کرو، غزل میں دے دیاں گا۔

رکشا والا مزید گھبرا کر کہتا ہے، نہیں نہیں تُسی مینوں پیسے دیو، تو یہ بڑے اطمینان سے کہتا ہے پیسے دینا تے مشاعرہ منتظم دا کم اے، میں نے مشاعرہ پڑھن لئی آں واں پیسے مل گئے تو تہھوں بھی دے دیاں گے۔

جاوید قاسم مشاعرہ پڑھنے آئے تو لگتا بہت سے شاعروں کو مار کر آ رہا ہے اور جب مشاعرے سے جاتا تھا تو لگتا تھا، مار کھا کر جا رہا ہے۔ ایک زمانے میں یہ "فنون" کے آفس میں آتا تھا، ایک بار جب یہ "فنون" آیا تو میں نے احمد راہی سے تعارف کروایا کہ یہ ہیں جاوید راہی تو احمد راہی نے قاسمی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا، قاسمی صاحب جس وقت میں راہی بنیا اس وقت تک کوئی اور راہی نظر نہیں آندا سی، تے ہُن اینٹ پٹو تے راہی نظر آجاندا اے، میرے خیال میں اس حادثے کے بعد ہی جاوید راہی نے خود کو جاوید قاسم بنایا، مگر اس جاوید راہی سے جاوید قاسم تک کا سفر اس کے لیے نیک شگون رہا کہ اس کے بعد سن 2000 میں یہ اپنا مجموعہ کلام پوری عمر کا دن شائع کروانے میں کامیاب ہوا۔ یہ مجموعہ عرفان صادق نے شائع کیا تھا۔ اس کے بعد جاوید قاسم نے بھرپور شاعری کی اور شاعری کے ساتھ ساتھ اپنا حلیہ چال چلن اور مشاعرہ پڑھنے کا نظریہ تک بدل لیا، پھر رفتہ رفتہ فرداً فرداً کانوں کان اس نے اپنے تمام دوستوں کو بتایا کہ وہ اب اُستاد جاوید قاسم بن گیا ہے اس لیے اب اسکو اسی لقب سے یاد کیا جائے۔ جاوید قاسم لفظ اُستاد کو سچا ثابت کرنے کے لیے آج کل خوب کھانس رہا ہے اور کہتا ہے میں بیمار ہوں مگر اس جیسا توانا شخص اور کوئی نہیں، جو کھانستے ہوئے بھی شعر سنا دیتا ہے، اور کہتا ہے میں نے کسے ہورنوں کھنگن بھی نہیں دینا، یہ کہہ کر خود دیر تک کھانستا رہتا ہے اور شعر بھی کہتا ہے کہ آخر یہ تو فل ٹائم شاعر۔

☆☆☆☆☆

کتاب سیف الملوک میاں محمدؒ بخش (تاثر)

آنکھ سے آنسو چھلکے ہیں اور دل سے اُٹھی ہوک
میرے دل کے گلشن میں اک پنچھی کی ہے کُوک

اس کے قصّے اس کے نغمے ہونٹوں پہ ممتاز
نام جو سیف الملوک ہے اس کا شعر ہیں سیف ملوک

سیدھے سبھاؤ چلتا جائے ملکوں شہروں دور
عقل سمجھ میں طاق ہوا ہے اس کو نہیں ہے چُوک

اس کی بزم گلابوں والی رنگ رنگیلی شام
شوق بھی اس کو گیتوں کا ہے صہبا کی ہے بھُوک

کیسا سفر ہے کیسے ارادے سیف ملوکی شان
چلتا رہا شہزادہ آگے پکڑی نہ کوئی چُوک

گھر سے عشق فسانہ لے کر گھوما ملکوں مُلک
اس کی منزل دُور ہے ثاقب پریوں کی مملوک

آصف ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پھر وہی مہرباں ہوا آئی
اے مری بے چراغ تنہائی

نظم [محنت کشوں کے نام]

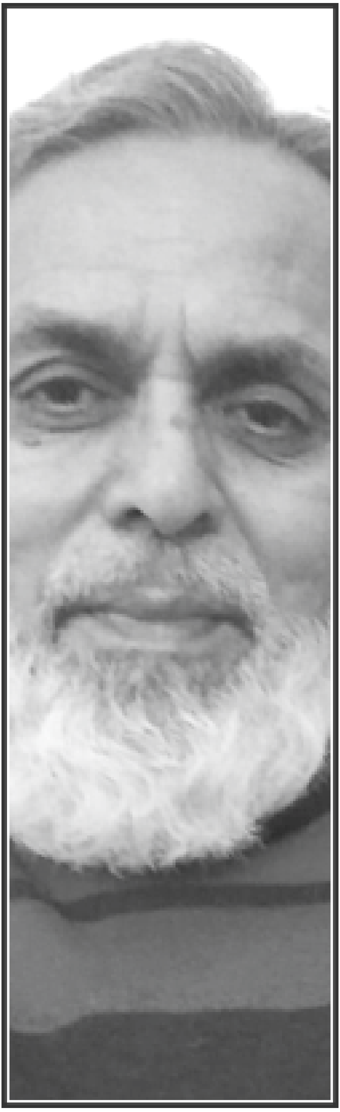

آہنی عزم ، چٹانوں کا بدن رکھتے ہیں
ہم ہر اک عہد کی تعمیر کا فن رکھتے ہیں

دیکھ مت دامنِ صد چاک ، کہ ہم خاک بسر
اپنے ہاتھوں میں زمانے کا چلن رکھتے ہیں

بانٹتے رہتے ہیں لوگوں میں تر و تازہ گلاب
اپنے آنگن میں گلِ رنج و محن رکھتے ہیں

کھیلتے رہتے ہیں ہم موت سے لمحہ لمحہ
ہم ہیں وہ لوگ ، جو کاندھے پہ کفن رکھتے ہیں

اپنے بچوں کو کھلاتے ہیں فقط رزقِ حلال
ہم پسینے میں بھی خوشبوئے چمن رکھتے ہیں

اے فراعینِ جہاں سُن کہ ہم آشفتہ مزاج!
راحتِ جاں کے لیے دار و رسن رکھتے ہیں

محمد انیس انصاری

چارہ گری

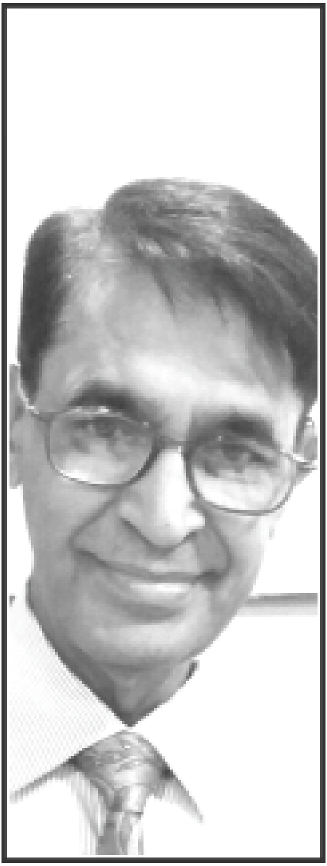

یہ ادویات کہ جو آس پاس رکھی ہیں
توقعات ہیں امیدِ زندگی کی طرح
توہمات ہیں شمعوں کی روشنی کی طرح
یہ ایک سانس کا اک سانس تک جو وقفہ ہے
سفر میں لمحہ، تاخیر کے سوا کیا ہے
یہ چارہ گر جو مرے آس پاس بیٹھے ہیں
بلا جواز خجل ہیں اداس بیٹھے ہیں
یہ ادویات یہ چارہ گری بہانہ ہے
یہ صرف خواب ہے یہ زندگی فسانہ ہے

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دکھوں کی زد میں تھی پتھر کی سل بھی
سو ڈھہ کر بہہ گئی دیوارِ دل بھی

اُداس نسلیں

منظور ثاقب

نہیں نہیں
یہ اداس نسلیں نہیں ہیں صاحب!
یہ تم کو سوچوں میں ڈوبے ڈوبے
جو دِکھ رہے ہیں
یہ شاہراہِ حیات کے ان
نئے تقاضوں کی جستجو میں
لگے ہوئے ہیں
کہ جن کی تکمیل ان کی منزل
ٹھہر گئی ہے
یہ اپنے پرکھوں کی طرح اب تو
کسی کے آقا غلام نا ہیں
یہ اپنی قسمت کے خود ہیں مالک
اور ارضِ عزت مآب کے ہیں
عظیم شہری
کہ سارتر، ژاں ژاک روسو
کے خواب تعبیر پا رہے ہیں
چراغِ امید ان کے ہاتھوں میں جل رہا ہے
یہ اس سے رستہ اجالتے ہیں
یہ اس سے رستہ نکالتے ہیں
عروسِ فردا ضرور ثاقب
اِنہی جوانوں کی منتظر ہے

جگہ خالی نہیں ہے

مرے دل کے مکاں کو دیکھ تو لیتیں!
تمناؤں کے روشن دان کا ٹوٹا ہوا کھانچا
یہاں پر
نامرادی کے پرندوں کا بسیرا ہے
سویرا ہوتے ہی مایوسیوں کے تنکے چننے لگتے ہیں
یہ خوابوں کی جو بجھتی لالٹینیں ہیں
غبارِ زندگی سے روشنی کا ہدیہ لیتے لیتے
زنگ خوردہ ہو گئی ہیں
گھپ اندھیرے میں بسی اک کوٹھڑی کی
زیب و زینت ہیں
پرانی آرزوؤں کے گلابوں سے بھرا دالان
اس میں سارا سارا دن اداسی گھومتی ہے
اور خموشی گنگناتی ہے
یہ لوہے کی سلاخوں والی دیدۂ غم ناک سی کھڑکی
ذرا سی بوندیں پڑتی ہیں تو اپنے آپ کھلتی ہے
گلی میں جھانکتی ہے
شاخ سے ٹوٹے ہوئے جذبوں کے پتوں کو
بڑی تیزی سے اندر کھینچ لاتی ہے
گزشتہ عمر کے ویران دروازے
سوادِ رائگانی کی طرف کھلتے ہیں
پچھتاوے کی سیلن سے بھری ڈیوڑھی
امیدوں کے گلابی پاؤں کی آہٹ کو سینے سے
لگائے کب سے بیٹھی ہے
کتابوں سے بھرے اس غم کدے کے کونے کونے میں
گلِ خندہ تھا کوئی جس کا اب تک لمس رہتا ہے
مگر اب تو یہاں لاحاصلی کی تتلیاں
منڈلاتی رہتی ہیں
نئے خوابوں کی تتلی !
تم یہاں آنے سے پہلے دیکھ تو لیتیں

طالب انصاری

برفیلی رت کا بین

یہ مقتل اگر گرم موسم میں سجتا
یہ لاشے اگر حبس میں زرد پڑتے
تو ان چھلنی جسموں سے رستے لہو کی بساند
اپنے گاڑھے بھنور میں بہت کچھ ڈبوتی
یہ مزدور کنبے،
مشقت کی کانوں میں تیشوں سے ترشے
بدن رکھنے والے،
نصیبوں جلی سرخ آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں
سے بھلا کتنے دن خاکِ مقتل بھگوتے
بھلا کس طرح جانے والوں کو اتنے دنوں
تک سرِ راہ رکھتے، سرِ راہ روتے

یہ ہے قاتلوں کی بہت مہربانی
خزاں بخت پیشانیاں رکھنے والوں کو
برفیلی رت میں نشانہ بنایا
لہو سوگواروں کا ان کی رگوں میں جمے جا رہا ہے
مگر برف خانۂ قدرت میں پیاروں
کی لاشیں حنوط اور محفوظ ہیں
سو تابوت سڑکوں پہ رکھ کر بہت دیر تک بیٹھ سکتے
ہیں اور بین کرتے ہوئے سوچ سکتے ہیں
آئندہ حملے کی تیاریوں میں مگن قاتلوں کو
خدا جانے اب کون سی رت موافق لگے گی!

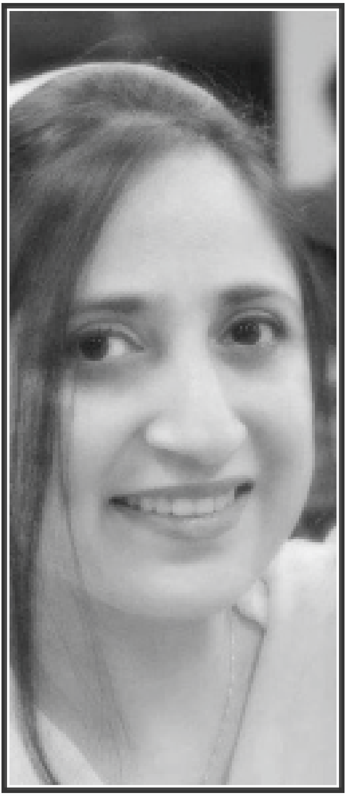

عنبرین صلاح الدین

یومِ تکبیر

آج کا یہ دن ہے اپنی عظمتوں کا اک نشاں
آج کا یہ دن ہے اپنی عزتوں کا پاسباں
آج کا یہ دن ہے اپنی رفعتوں کی داستاں

آج کا یہ دن مرے قائد کی محنت کا سفیر
شاعرِ مشرق کے شہرِ فکر کا بابِ منیر
آج کا یہ دن ثمر، تو آج کا یہ دن قدیر

آج کے دن سے ہماری منزلت ہے، شان ہے
آج کے دن سے ہماری ہر جگہ پہچان ہے
آج کا دن تو حقیقت میں ہماری جان ہے

اے عظیم المرتبہ دن! تیری شوکت کو سلام
سرزمینِ پاک کو تجھ سے ملا گویا دوام
تو عنایاتِ خدا ہے تحفۂ خیر الانامؐ

آج کا دن معتبر ہے منفرد ہے، طاق ہے
شاملِ جشن و مسرت، آج تو آفاق ہے
جس قدر ہیں، زہرِ مہلک ان کا یہ تریاق ہے

آج کے دن وہ نئی تنویر چاغی کو ملی
ایٹموں کی جس طرح تفسیر چاغی کو ملی
کیا کہوں میں کس قدر توقیر چاغی کو ملی

شوکت محمود شوکت

اک بار پھر ماضی میں جی لیں

مجھے پرندوں کی آوازیں سننا بہت اچھا لگتا تھا
جی چاہتا پہروں بیٹھ کر سنتی رہوں
بادل جب آسمان پر رقص کرتے
ان میں اپنی من پسند شبیہ ڈھونڈنا من بھاتا تھا
بارش کی بوندوں کا ہوا کی تال پر پتوں پر رقص
کتنی سندر لگتی تھی اس منظر میں

تمہارے ساتھ بیٹھ کر کافی پینا
تمہارے لبوں سے اپنے شعر سننا
تمہیں سنانا اک خواہش تھی

مصروفیت سارے پل نگل گئی
جدت نے زیست میں نئے رنگ بھر دیئے ہیں
ایک کلک پر کڑی دھوپ میں بھی
میں بارش کو ڈیجیٹل سکرین
پر سن سکتی ہوں
من کو اشانت کرنے والے ایسے کئی
مناظر مختلف ایپس پر محفوظ ہیں
تم بھی میرے پیج پر میری غزلیں پڑھتے ہوگے
کئی نظمیں محفوظ ہیں آواز میں میری
سنی تو ہوگی

فاصلے کہاں فاصلے رہے ہیں
میلوں کی دوری پر بھی ہم اک دوجے کو
لائیو دیکھا اور سن سکتے ہیں

ایک ہی گھر کے ہر کمرے میں اک نئی دنیا آباد ہے
برقی رابطوں سے سب
اک دوجے سے جڑے ہیں

لیکن روح میں کیسا خلا ہے
بھر نہیں پاتا
فاصلہ ہے کہ بڑھتا جاتا ہے
کسی بھی طور گھٹ نہیں پاتا

اتنی مصروف ہوں کہ وقت بھی مجھے ڈھونڈ نہیں پاتا اور
اتنی تنہا کہ تنہائی بھی میری تلاش میں سرگراں رہتی ہے

جی چاہتا ہے وقت کی گلک سے کچھ پل چرا لوں
جہاں میں ماضی میں سانس لے سکوں
رنگوں تتلیوں بادلوں کے ساتھ اڑ پاؤں
تمہارے شانے پہ سر رکھ کر
تم سے تمام ان کہی باتیں کہہ دوں
جواب میں تم دل والا ایموجی بھیجنے کے بجائے
مجھ سے اپنے دل کی کتھا کہو
حال سے کچھ پل چرا کر
اک بار پھر ماضی میں جی لیں

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

نائلہ راٹھور

بچپن

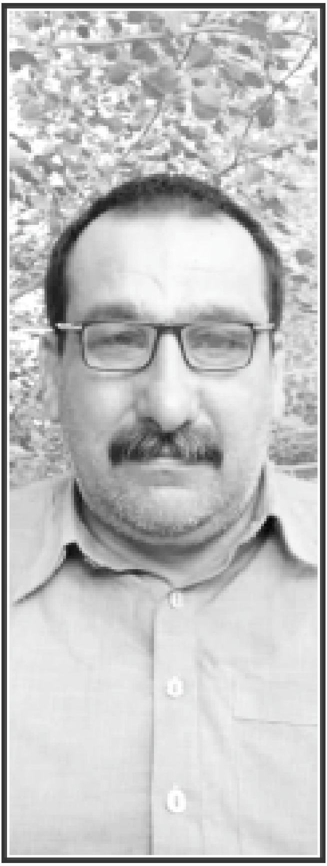

ساون کے بھی گئے موسم

میں اک پیاسا صحرا

میرا سندر سندر جیون

برزخ بنتا جاتا ہے

بچپن کے وہ بیتے لمحے

کون مجھے لوٹائے گا

بھاگتی دوڑتی اس دنیا میں

میرے کرچی کرچی ارماں

کون سمیٹ کے لائے گا

کون سمیٹ کے لائے گا

سید طاہر شیرازی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چلو دل اُس کا وفادار کر کے دیکھتے ہیں
خدا کے ساتھ یہ بیوپار کر کے دیکھتے ہیں

رات کا ایندھن

میں نے لکھا
دیواروں پر
دروازوں پر
اور اس لان میں
ایک پرانے
داڑھی والے برگد پر

باہر جا کر
لیمپ پوسٹ کے نیچے بکھرے
سبھی پرانے وقت چنے

اندر آ کر
آتش دان کی راکھ کریدی
ہر اک سوکھا لمحہ آتش دان میں پھینکا
باقی لمحے
چھت پر جا کر
دھوپ میں ڈالے

شام ڈھلے تک
رات کا ایندھن......

...... اور کہانی بن جائے گی!

وقار احسن

نظمیہ دھڑکن

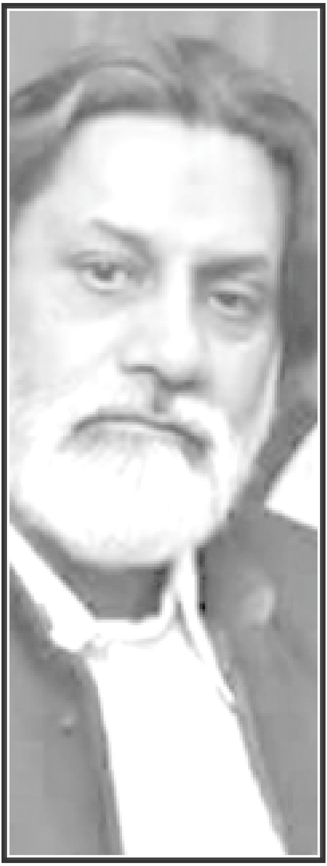

اک جیسی ہی گلیاں ساری اک جیسے ہیں گھر
تیری چوکھٹ ڈھونڈ رہا ہوں جہاں جھکاؤں سر

جنگل جنگل سبزہ دیکھا، روش روش پر پھول
اندر اندر بارش بھگتی جسم ہے دھولوں دھول

حرف ہتھیلی پر رکھے ہیں انگاروں جیسے
جسم کا قصہ پاک ہوا ہے قدم اُٹھے کیسے

آخر آخر پہلی یادیں آنسو بنتی ہیں
پھر یہ یادیں دھیرے دھیرے آتش لگتی ہیں

میں بنجارہ لاد چکا ہوں بستر اور خیمہ
اک تارے کے ساتھ پھروں میں ڈرا ڈرا سہما

اعجاز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد اگر آنکھیں نہیں، دامن ہی بچھا دے
اب چھت سے اُترنے کو یہ سنسان سا دن ہے

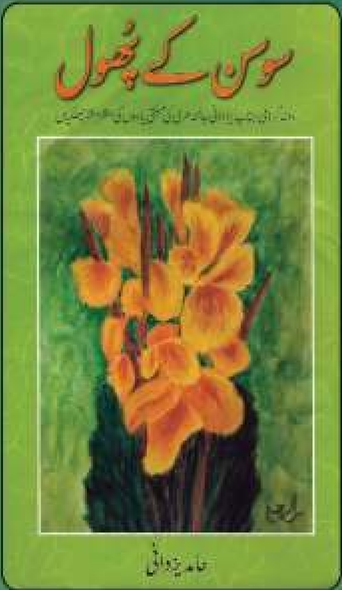
سوسن کے پھول
حامد یزدانی

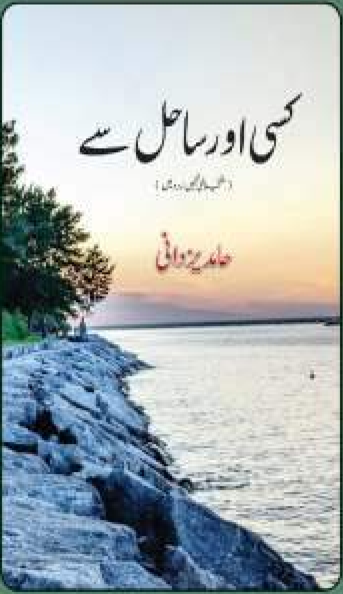
کسی اور ساحل سے
حامد یزدانی

آبگینے خوابوں کے

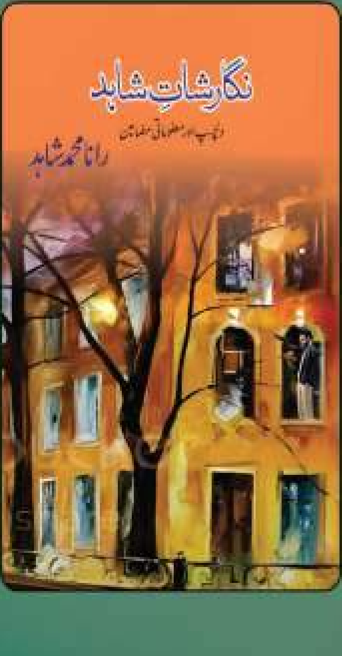
نگارشاتِ شاہد
رانا محمد شاہد

حسان بن ثابت سنٹر فار ریسرچ ان نعت لٹریچر منہاج یونیورسٹی لاہور اور نعت فورم انٹرنیشنل کے باہمی اشتراک سے

چوتھی قومی ادبی نعت کانفرنس 2025

نعت: 21ویں صدی کے تخلیقی و تنقیدی رجحانات

نعت فورم انٹرنیشنل اور ایچ سی آر این منہاج یونیورسٹی لاہور کے زیر اہتمام چوتھی قومی ادبی نعت کانفرنس 2025